MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

4

اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن کی تدریس و تفہیم

بلاک 4 کا تعارف	
اکائی 13	
ملا اسد اللہ وجہیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ	201
اکائی 14	
محمد نصرت نصرتیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ	215
اکائی 15	
شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ	231
اکائی 16	
میر غلام حسنؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (سحر البیان: داستان وارد ہونے بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں)	247
اکائی 17	
پنڈت دیا شنکر نسیمؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاولی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)	267
اکائی 18	
مرزا تصدق حسین شوقؔ لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہر عشق: معشوق کی رخصتی)	285

بلاک 4 تعارف

بلاک ۴ 'اُردو کے نمائندہ مثنوی نگاروں کی مثنوی نگاری' سے متعلق ہے جس میں تیرہ سے اٹھارہ تک اکائیاں شامل ہیں۔

تیرہویں اکائی کا عنوان (ملا اسداللہ وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ) ہے۔ اس میں اُردو کے بلند پایہ مثنوی نگار ملا وجہی کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی شاہ کار مثنوی 'قطب مشتری' کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی محاسن، امتیازات اور اس کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چودہویں اکائی بعنوان (محمد نصرت نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ) ہے۔ اس میں اُردو کے منفرد و ممتاز مثنوی نگار نصرتی کے مختصر سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، ان کی معروف ترین مثنوی 'علی نامہ' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس کے فکری و فنی محاسن، امتیازات اور اس کی انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پندرہویں اکائی (شیخ محمد مظہرالدین ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ) کے عنوان سے ہے۔ اس میں اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار ابن نشاطی کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے، ان کی مشہور مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں اور اس کی انفرادیت سے بحث کی گئی ہے۔

سولہویں اکائی کا عنوان (میر غلام حسن: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے عظیم المرتبت مثنوی نگار میر حسن کے سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں، خصوصیات و امتیازات اور اس کی انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کے منتخب اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

سترہویں اکائی بعنوان (پنڈت دیاشنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے ممتاز مثنوی نگار پنڈت دیاشنکر نسیم کے حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اس کی انفرادیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'گلزار نسیم' کے منتخب اشعار کی تشریح پیش کی گئی ہے۔

اٹھارہویں اکائی (مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) کے عنوان سے ہے۔ اس میں اُردو کے اہم مثنوی نگار نواب مرزا شوق لکھنوی کے سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اس کے انفرادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

اکائی 13 ملا اسداللہ وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ

ساخت

13.1 اغراض و مقاصد
13.2 تمہید
13.3 ملا اسداللہ وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ
13.3.1 ملا اسداللہ وجہی کے سوانحی احوال و کوائف
13.3.2 ملا اسداللہ وجہی کے ادبی کارنامے
13.3.3 ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کا جائزہ
13.3.4 ماحصل
13.4 آپ نے کیا سیکھا؟
13.5 اپنا امتحان خود لیجیے
13.6 سوالوں کے جوابات
13.7 فرہنگ
13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- ملا اسداللہ وجہی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- ملا اسداللہ وجہی کے ادبی کارناموں سے آگاہ ہوں گے۔
- ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' سے بحث کریں گے۔
- ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کی خصوصیات و امتیازات سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- اُردو مثنوی نگاری میں ملا اسداللہ وجہی کے مقام و مرتبے کو سمجھیں گے۔

13.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔ آپ نے مثنوی کی اقسام، دکن اور شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے ارتقا، نمائندہ مثنوی نگار اور نمائندہ مثنویوں

سے واقفیت حاصل کی اور دکن اور شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو بھی سمجھا۔اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار ملا اسداللہ وجہی کے سوانحی احوال وکوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' سے بحث کریں گے اور اس کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔ساتھ ہی اُردو مثنوی نگاری میں ان کے مقام ومرتبے کو سمجھیں گے۔

13.3 ملا اسداللہ وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ

13.3.1 ملا اسداللہ وجہی کے سوانحی احوال وکوائف

ملا اسداللہ وجہی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں، البتہ ملا وجہی نے اپنی مثنوی میں اپنے حالات زندگی کے متعلق جو اشارے کیے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے آباواجداد اصلاً خراسان کے باشندہ تھے۔اکبرالدین صدیقی نے بھی وجہی کے فارسی دیوان کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی ہے لیکن ان کی طبع پاک کو خراسان سے نسبت ہے۔'حیات وجہی' کے مصنف م۔ن۔سعید کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آباواجداد ۹۷۳ھ کے قریب اپنے وطن سے ہجرت کر کے گول کنڈہ آئے تھے۔بہمنی عہد سے ہی دکن میں ترکی وایرانی آکر نہ صرف اپنی زندگی گزار رہے تھے بلکہ انھیں دربار کے امور میں بھی نمایاں ذمہ داریاں ملی ہوئی تھیں۔اس وقت خراسان میں شیعوں پر ظلم کیے جا رہے تھے اور دکن کے حالات سازگار تھے۔لہٰذا وہاں سے بہت سے خاندان ہجرت کر کے دکن آگئے تھے جن میں وجہی کا خاندان بھی تھا۔ملا وجہی کی پیدائش کس سن میں ہوئی۔اس سلسلے میں ناقدین ادب کے الگ الگ نظریات ہیں۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے وجہی کا سن پیدائش ۱۵۵۸/ ۱۵۵۵ء قرار دیا ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے ۹۹۶ھ کو وجہی کا سن پیدائش بتایا ہے۔ڈاکٹر نورالسعید اختر کے مطابق وجہی کی پیدائش کا زمانہ ۱۵۶۷ء تا ۱۵۶۸ء ہے۔بیش تر محققین نے ملا وجہی کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' میں موجود اندرونی شہادتوں کو بنیاد بنا کر ان کا سن ولادت متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش کے زمانے کو ہی وجہی کا بھی سنِ پیدائش قرار دیا ہے۔اکثر تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وجہی ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء-۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ملا وجہی نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔وجہی کی جائے پیدائش کے تعلق سے کوئی مستند ثبوت موجود نہیں ہے لیکن وجہی نے اپنی مثنوی 'قطب مشتری' میں اپنی تعریف کے ساتھ ساتھ دکن اور تلنگانہ کی خوب تعریف کی ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

دکن سے نگینہ انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہے لگ
دکن ملک کو دھن عجب ساج ہے　　کہ سب ملک سر اور دکن تاج ہے

دکن کی تعریف میں مذکورہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ملا وجہی کے بعد کے شعرانے بھی انھیں ملک دکن کا ہی شاعر قرار دیا ہے۔ وجہی کا اصل نام اسد اللہ تھا۔ شاعری میں انھوں نے اپنے لیے کئی تخلص استعمال کیے ہیں۔ وجہیا، وجیہہ، وجہی اور وجیہی ان کے مختلف تخلص ہیں۔ وجہی کے ہم عصر شاعر غواصی نے انھیں وجہی کے تخلص سے یاد کیا ہے اور ان کا یہی تخلص عوام وخواص میں مشہور ہے۔ ملا وجہی نے اپنے ایک فارسی شعر میں اپنا نام و تخلص اس طرح بیان کیا ہے:

اسم اسد اللہ وجیہہ است تخلص　　آرائش دکانچہ بازار کلام است

وجہی کے ابتدائی حالات اور ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق تذکروں میں تشفی بخش معلومات درج نہیں ہیں۔ البتہ م۔ن۔ سعید نے اپنی کتاب 'حیات وجہی' میں اپنی تحقیقی کاوشوں سے وجہی کے کچھ ابتدائی نقوش اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وجہی کے آبا واجداد علم وادب کے زیور سے آراستہ تھے۔ جب وہ ترک وطن کر کے گول کنڈہ پہنچے تو انھیں ان کی علمی حیثیت کے پیش نظر دربار میں کوئی نہ کوئی ذمہ داری دی گئی ہوگی جو اس زمانے کا دستور تھا۔ ان کے مطابق ملا وجہی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں فارغ البالی اور خوش حالی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کی تربیت اسی خوش گوار ماحول اور دکنی تہذیب وتمدن میں ہوئی تھی۔ ملا وجہی کو مذہبی طور پر شیعہ عقائد کا ماننے والا بتایا گیا ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی میں نعت کے بالمقابل حضرت علیؓ کی مدح میں کثرت سے اشعار کہے ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو خلفائے راشدین میں سب سے افضل قرار دیا ہے۔ پروفیسر رشید خان نے اپنی کتاب 'اُردو کی تین مثنویاں' میں اسی نظریے کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ملا وجہی خود بھی شیعہ مسلک کا تھا۔ قطب مشتری میں اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ نعت کے ۲۶ اشعار ہیں۔ اس کے مقابلے میں منقبت تقریباً پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ اگر ذکر معراج کے اشعار بھی نعت میں شامل کر لیے جائیں تو ان کی تعداد ۶۰ ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذکر معراج بھی حضرت علیؓ کی فضیلت اور بزرگی بتلانے کے لیے کیا گیا ہے۔''

(پروفیسر خان رشید، اُردو کی تین مثنویاں، چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص:۸۵)

حالاں کہ اس سبب سے ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں فیصلہ کرنا محلِ نظر ہے۔ ملا وجہی کو کم عمری سے ہی شعرو ادب سے گہری دل چسپی تھی۔ انھوں نے بچپن سے ہی شعر گوئی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن انھیں شہرت قلی

قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہوکر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ اس حوالے سے جاوید وششٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''محمد قلی کے عہد میں اس کی شہرت و مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ وہ قطب شاہی دربار کا سب سے بڑا شاعر اور گول کنڈہ کا ملک الشعرا تھا۔''
> (جاوید وششٹ، ملا وجہی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۵)

محمد قلی قطب شاہ کی قربت نے جب ملا وجہی کی زندگی کو قابلِ رشک بنا دیا تو ان کے حاسدین کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ قلی قطب شاہ کے بعد جب محمد قطب شاہ سلطان بادشاہ بنے تو حاسدوں نے وجہی کے خلاف انھیں بھڑکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ملا وجہی کا وہ مرتبہ نہ رہا جو قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا۔ اس دور میں انھیں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد جب عبداللہ قطب شاہ بادشاہ بنے تو وجہی کے خوش حال دن پھر واپس آگئے اور وہ دوبارہ دربار سے وابستہ ہوگئے۔ عبداللہ قطب شاہ نے وجہی کے علمی مقام و مرتبے کو سمجھتے ہوئے ان سے کتاب لکھنے کی فرمائش کی اور ملا وجہی نے اُردو کی مشہور تمثیلی داستان 'سب رس' لکھی جس کے تذکرے کے بغیر اُردو نثر کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ ملا وجہی کی وفات سے متعلق بھی کوئی مستند حوالہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء کو وجہی کا سن وفات قرار دیا ہے، جس پر بیش تر محققین نے اتفاق کیا ہے۔ البتہ جاوید وششٹ جنھوں نے وجہی کے تعلق سے اہم تحقیقی کام کیا ہے، کی رائے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حق بات تو یہ ہے کہ وجہی کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات دونوں پر لاعلمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ محققین نے اس پردے کو اٹھانے کی کوشش میں جو قیاس آرائیاں کی ہیں، ان سے معاملہ کچھ اور الجھ گیا۔ وجہی نے بھی اپنی کسی تصنیف میں اس گتھی کو نہیں سلجھایا۔''

(جاوید وششٹ، ملا وجہی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۸)

ڈاکٹر زور نے 'تذکرہ مخطوطات' جلد چہارم میں لکھا ہے کہ ملا وجہی رُوحانی طور پر سید حسن برہنہ شاہ کے معتقد تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے امیر مالک پرست خان نے برہنہ شاہ کی درگاہ کی تعمیر مکمل کی تھی۔ اسی درگاہ کے احاطے میں اسداللہ وجہی کے دفن ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

13.3.2 ملا اسداللہ وجہی کے ادبی کارنامے

ملا وجہی دکن کے ممتاز شاعر اور باکمال نثر نگار تھے۔ انھیں فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔

عربی زبان سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ وجہی کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی طبیعت خلاقانہ تھی۔ خدا نے انھیں بہترین قوت حافظہ، ذہانت اور وسعت نظر عطا کی تھی۔ انھوں نے فارسی کے اعلیٰ ترین ادب کے ساتھ حافظؔ، شیرازیؔ، سعدیؔ، خاقانیؔ، عرفیؔ، حسنؔ اور کمالؔ جیسے شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں جا بہ جا کیا ہے۔ ہندوستانی زبانوں اور علوم سے بھی انھیں گہری واقفیت تھی۔ ہندو دیو مالا، رامائن اور مہابھارت جیسے عظیم رزمیوں پر ان کی گہری نظر تھی جس کا ذکر وجہی نے اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے۔ م۔ن۔سعید نے ان کی علمی وادبی صلاحیت سے متعلق لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اس نے تحصیل علم کے شوق کو تا حیات باقی رکھا۔ تاریخی ترتیب سے اس کی ہر کتاب پچھلی کتاب سے زیادہ معلومات انگیز اور وقیع ہے لیکن عہد شباب میں جہاں وہ فارسی، عربی ادبیات کا مطالعہ جاں فشانی سے کر رہا تھا اور اپنے علم میں مسلسل اضافے کر رہا تھا، وہیں اپنے ماحول کی ادبی اور لسانی روایات کو پورے انہاک سے سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔''
>
> (م۔ن۔سعید، حیات وجہی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۳۴۔۳۷)

وجہی اظہار و بیان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں 'قطب مشتری'، 'سب رس' اور 'تاج الحقائق' جیسی مشہور کتابوں کے علاوہ 'ماہ سیما و پری رخ'، 'صراط المستقیم فی دین قویم'، فارسی دیوان اور دکنی غزلیں وغیرہ قابل ذکر ہیں جو دستیاب ہیں۔

ماہ سیما و پری رخ:

مثنوی 'قطب مشتری' ملا وجہی کے کمالِ فن کا شاہ کار ہے۔ ملا وجہی نے ایک اور مثنوی 'ماہ سیما و پری رخ' کے نام سے تحریر کی تھی جس کا ذکر کئی محققین نے کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اسے وجہی کی دوسری مثنوی قرار دیا ہے جب کہ پروفیسر ضامن علی نے اپنی کتاب 'جائزہ زبانِ اُردو' میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ محمد حفیظ الہ آبادی کے کتب خانے میں محفوظ ہے لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے۔

دیوان وجیہہ فارسی:

محققین نے لکھا ہے کہ وجہی کو کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ نہ صرف فارسی زبان اور اس کے شعر و ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے بلکہ خود بھی فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس کا ثبوت ان کا فارسی دیوان ہے جس کے بارے میں جاوید وششٹ نے لکھا ہے:

''دیوانِ وجیہہ (فارسی) کا ایک نادر و نایاب قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کی دریافت کا سہرا پروفیسر اختر حسن کے سر ہے۔ میں نے وجہی کے فارسی دیوان کا انتخاب 'آشوبِ دل' کے نام سے مرتب کیا ہے۔''

(جاوید وششٹ، ملا وجہی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۵۹)

تاج الحقائق:

شاعری کے علاوہ نثر میں ملا وجہی کی پہلی یادگار تصنیف 'تاج الحقائق' ہے۔ یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ حالاں کہ اس سلسلے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ تصنیف ملا وجہی کی ہے یا کسی اور کی۔ مولوی عبدالحق نے 'سب رس' کے مقدمے میں اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ محمود شیرانی، عبدالقادر سروری اور اکبرالدین صدیقی کا بھی یہی موقف ہے جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر گیان چند جین نے اسے وجیہہ الدین گجراتی کی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے ڈاکٹر نورالسعید اختر نے ترتیب و تدوین کر کے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''اس کتاب (تاج الحقائق) کی تدوین و ترتیب کر کے ڈاکٹر نورالسعید اختر نے سب سے پہلے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ ملا وجہی ہی کی تصنیف ہے اور اس کا اصلی نام 'تاج الحقائق' ہی ہے۔''

(ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، ملا وجہی اور انشائیہ: ایک تحقیقی مطالعہ، حسن پبلی کیشن، ممبئی، ۱۹۸۸ء، ص: ۴۵)

سب رس:

ملا وجہی کی مشہور تصنیف 'سب رس' ایک تمثیلی داستان ہے۔ یہ کتاب انھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کتاب کو اُردو میں غیر مذہبی نثر کا سب سے پہلا مکمل نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملا وجہی نے اس کتاب میں عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اس میں اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وجہی نے اس کتاب میں نظم و نثر کو ملا کر ایک جدید طرز ایجاد کی ہے۔ اس کتاب پر ملا وجہی کو بہت فخر تھا۔ محققین نے وجہی کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے وجہی کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک کتاب 'صراط المستقیم فی دین قویم' ہے جس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ، حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر جمال

شریف نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو شاعری ولی سے پہلے' میں وجہی کی ایک اور کتاب 'عقائد وجہی' کا ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ملا وجہی نے کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں، البتہ 'قطب مشتری' اور 'سب رس' ان کی مشہور ترین کتابیں ہیں۔

13.3.3 ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کا جائزہ

ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کو دکنی مثنویوں میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ اس مثنوی کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی سے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق 'قطب مشتری' کا زمانہ تصنیف ۱۰۱۸ھ بمطابق ۱۶۰۹ء ہے اور یہ مثنوی صرف بارہ دن میں تحریر کی گئی تھی جیسا کہ خود وجہی نے لکھا ہے کہ ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی۔

تمام اس کیا دیس بارا منے　　　　سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا منے

یعنی ۱۰۱۸ھ میں بارہ دن میں لکھ کر پوری کر دی۔ محققین کی عام رائے ہے کہ 'قطب مشتری' کا قصہ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی داستان ہے لیکن کچھ محققین اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'قطب مشتری' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''اس میں در پردہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ وہ واقعہ بھی عالمِ شہزادگی کا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا''۔ مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، بھاگ متی کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس۔ سیدہ جعفر نے بھی کلیات قلی قطب شاہ کے مقدمے میں 'قطب مشتری' کو وجہی کا خالص تخیلی اور رومانی قصہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا محمد قلی قطب شاہ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر خان رشید وغیرہ نے اس تصنیف کے قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق ہونے کو زیادہ قرین قیاس مانا ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور تمام تر تحقیقات پر نظر ڈالنے کے بعد لکھا ہے:

> ''بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کا عشق کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی جو وجہی کے لیے اسے پس منظر بنانا ناقابل عمل ہوتا یا مصلحت کے خلاف بات ہوتی۔ قطب شاہی دور کی تاریخوں کے علاوہ خود قلی قطب شاہ کے کلام میں اس کے اشارے موجود ہیں۔ نظم 'جلوہ' اور 'بارہ پیاریاں' میں بھاگ متی کا ذکر ہے۔ نیز کلیات کے صفحہ ۹۰، ۱۶۱، ۱۶۴، ۲۱۷، ۲۵۷، ۲۶۸ اور ۳۱۲ پر صریحاً بھاگ متی کے متعلق گتھی کو بہ خوبی سمجھا دیا ہے۔ زور لکھتے ہیں کہ محمد قلی نے بھاگ متی کو خود ہی

حیدرمحل کا خطاب دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اس کی محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدر آباد بدل دیا تھا۔ مصنف تاریخ فرشتہ نے اسے فاحشہ لکھ دیا تھا۔ اسی واقعہ کی پردہ پوشی کے لیے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کیے گئے کہ درباری شاعر ملا وجہی سے ایک مثنوی بہ طور خاص بھاگ متی کی وفات پر ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی جس میں اصل واقعہ کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا۔''

(ڈاکٹر وہاب اشرفی، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۸)

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ 'قطب مشتری' میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس کا تعلق مشہور رقاصہ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قلی قطب شاہ نوجوانی میں اس پر عاشق ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے سماجی رتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے وجہی نے بھاگ متی کو مشتری کا رُوپ دے کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کا مرکزی کردار دکن کا شہزادہ محمد قلی قطب شاہ ہے۔ اس کی ہیروئن بنگال نگر کی شہزادی مشتری ہے اور یہی بھاگ متی ہے جو محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ ہے۔

یہ مثنوی ایک منظوم طربیہ قصہ پر مشتمل ہے۔ کہانی کا آغاز روایتی انداز کا ہے۔ یہاں بھی پرانی داستانوں کی طرح ابراہیم قطب شاہ کے لاولد ہونے کے منظر سے مثنوی کا آغاز ہوا ہے۔ ہزار منتوں کے بعد اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد قلی قطب شاہ رکھا گیا۔ شہزادے کی تعلیم وتربیت کا بہترین نظم کیا گیا۔ دھیرے دھیرے شہزادہ جوان ہوا۔ ایک رات عیش ومستی کی شاہی مجلس سجی، شراب کے دور چلے اور اسی عالم میں شہزادہ نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔ نیند میں اس نے ایک خواب دیکھا جس میں اسے ایک پری رخ نازنین نظر آئی جس پر وہ دل وجان سے عاشق ہوگیا۔ اس کا مرض عشق بڑھتا گیا۔ ماں باپ اس کی حالت دیکھ کر مجبور ہوگئے اور اسے اپنے دوست عطارد کے ساتھ خواب کی شہزادی کی تلاش میں نکلنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ شہزادہ تلاشِ معشوق میں نکلتا ہے اور بے شمار پریشانیوں کے بعد اپنی محبوبہ 'مشتری' کو پالیتا ہے۔ یہیں کہانی ختم ہوجاتی ہے۔ 'قطب مشتری' کی پوری کہانی اس مختصر اور سادے سے پلاٹ کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس پورے پلاٹ میں مافوق الفطری عناصر سے کام لیا گیا ہے۔ حالاں کہ قطب اور مشتری جیسے کردار حقیقی ہوسکتے تھے لیکن جس طرح کے واقعات یا حادثات مثنوی کے قصے میں پیش آئے ہیں، وہ خلاف حقیقت ہیں جن کا تعلق مافوق الفطری مظاہر سے ہے۔ کہانی خواب کے دھندلے نقوش سے شروع ہوتی ہے اور شہزادہ خوب رُو دوشیزہ کے عشق میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ خواب میں دیکھی گئی دوشیزہ کی تلاش کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پھر مشہور زمانہ مصور عطارد ایک تصویر دکھاتا ہے

اور شہزادے کو اس کے خوابوں کی دوشیزہ کی تصویر مل جاتی ہے۔ اب دکن سے ارض بنگالہ تک کا سفر شروع ہوتا ہے جس میں شہزادے کو مصیبتوں، اذیتوں اور پریشانیوں کا جگہ جگہ سامنا ہوتا ہے۔فوق الفطری ماحول کی تشکیل ہوتی ہے اور عجیب الخلقت کردار سامنے آتے ہیں۔ اژدہا اپنے منہ سے آگ اُگلتا ہے جس سے مقابلہ ہوتا ہے۔ تین سر، چار ہاتھ اور بڑے بڑے دانتوں والا راکشس سامنے آتا ہے جو ہر صبح نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ اس کو شکست دینے کے لیے شہزادہ آیۃ الکرسی کا حصار باندھتا ہے اور راکشس کو قتل کرنے میں کام یاب ہوجاتا ہے۔ راکشس کا ذکر وجہی کچھ یوں کرتے ہیں:

وو راکشس کے بالاں میں سانپاں ہیں یوں چچوندے پڑے اچھتے بیلاں ہیں جیوں

صبا اٹ نہاری کرے نو ہتی کہ ملعون وو ہے بڑا نکبتی

پوری کہانی میں فوق فطری عناصر کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو غیر معمولی حسن، قوت و طاقت اور صلاحیت کے مالک ہیں جن کو دیکھ کر چاند اور سورج شرمندہ ہوتے ہیں۔ وہ دیو اور راکشس کو مغلوب کرسکتے ہیں۔ جنگی فنون میں ماہر ہونے کے باوجود مقابلے کے وقت وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کرتے بلکہ کوئی فقیر، سادھو، مہاتما، پیر یا خضر سامنے آتے ہیں یا پھر وہ خود دعائیں، اسم اعظم یا کوئی منتر پڑھ کر یا پھر اپنی تعویذ چوم کر دعا کرتے ہیں اور فتح یاب ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر مظاہر، کردار اور حادثات وواقعات مافوق الفطرت ہی ہیں۔

ملا وجہی نے اس مثنوی کو گیارہ کرداروں کے سہارے تشکیل دیا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ، قلی قطب شاہ، عطارد، مشتری، زہرہ، مریخ خاں، شاہ سرطان، وزیر اسد خاں، مہتاب پری، سلکھن پری، مہرواں دائی وغیرہ اس مثنوی کے اہم کردار ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار قلی قطب شاہ ہے جن کے گرد سارا پلاٹ بنا گیا ہے۔ وجہی نے اس کردار کو مثالی شخصیت کے رُوپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی میں داستانوی کردار بار بار سامنے آتے ہیں۔ شہزادے میں فوق فطری عادتیں ہر موڑ پر نظر آتی ہیں۔ مثلاً اس کی ولادت کے وقت چاند کے پانسے ڈال کر سورج نے بتایا کہ شہزادہ علم وآگہی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ذہانت وفطانت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ قوی و بہادر اتنا کہ مست ہاتھیوں کو پچھاڑ دے مگر پورے قصے میں اس کا عمل دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انتہائی معمولی قسم کا فرد ہے۔ خواب میں دیکھی ہوئی محبوبہ کو اس روئے زمین پر تلاش کرنے نکل جاتا ہے۔ یہی نہیں اس سفر میں انتہائی ہیبت ناک اژدہے کو موت کی نیند سلاتا ہے۔ ساتھ ہی ایک ایسے راکشس کو اپنی تلوار سے ڈھیر کرتا ہے جو نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ وجہی نے قطب کے کردار کو پیش کرنے کے لیے ایسی طلسماتی اور تحیر خیز فضا قائم کی ہے کہ اس کی شخصیت کا درست سرا ہی نہیں مل پاتا۔ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آیا یہ کردار انسان ہے یا پھر اس کا تعلق جن و دیو کے قبیل سے ہے کیوں کہ وجہی کی پیش کردہ تصویر اور اس کے نقوش وحرکات سے یہ کردار مافوق

فطری اور حقیقی دنیا کے کردار کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کردار کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ اپنے مقصد عشق کے حصول میں کبھی کوتاہی نہیں برتتا۔ اسے عطارد کے مشورے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے اور وہ سفر کے راستے میں آنے والی پریشانیوں سے اسے ڈراتا بھی ہے لیکن یہ پیچھے نہیں ہٹتا اور عشق کی راہ میں آنے والی تمام تر رُکاوٹوں کو دور کرتا ہوا اپنے معشوق سے ملنے کی جدو جہد کرتا رہتا ہے۔ مثنوی 'قطب مشتری' کا دوسرا اہم اور مرکزی کردار 'مشتری' ہے جو بنگال کی شہزادی ہے اور جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ سخاوت اس کی پہچان ہے۔ فن کاروں کی قدر دان ہے۔ وفا شعاری اور ثابت قدمی اس کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ریاست چھوڑ کر اپنے محبوب کے ساتھ روانہ ہونے سے گریز نہیں کرتی ہے۔

ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' میں فنی لحاظ سے کئی خوبیاں ہیں۔ اس مثنوی کے مکالمے اور کرداروں کی باہمی گفتگو نہایت مناسب، برجستہ اور برمحل ہے۔ وجہی نے پوری کوشش کی ہے کہ کرداروں کے معاشرتی رتبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان سے مکالمے ادا کرائے جائیں۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت اس میں موجود کرداروں کی جذبات نگاری ہے۔ دراصل وجہی کو انسانی نفسیات اور جذبات کا گہرا شعور تھا۔ ملا وجہی نے اس مثنوی میں کئی مقامات پر جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ منظر نگاری کے معاملے میں بھی اس مثنوی کو نمایاں مقام حاصل ہے اور اس وقت کے لحاظ سے منظر نگاری کے عمدہ نمونے اس میں موجود ہیں۔ وجہی نے اس مثنوی میں داستانِ عشق بیان کرتے ہوئے اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی جھلک بھی پیش کی ہے۔ اس عہد کے دربار، توہمات، عقائد، اقدار، روایات اور سامانِ آرائش و زیبائش کے علاوہ متعدد معاشرتی اور تمدنی تفصیلات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ملا وجہی کئی زبانوں سے واقف تھے بالخصوص دکنی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اس کی جھلک بھی اس مثنوی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مثنوی میں سلاست، روانی اور متانت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وجہی نے ثقیل الفاظ سے گریز کیا ہے۔ فارسی، عربی اور ہندی الفاظ سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور ہر شعر اور ہر جذبے کے لیے مناسب و موزوں لفظ استعمال کیے ہیں۔ محاورے، روزمرہ، تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کو بہت ہنرمندی سے برتا ہے۔ غرض یہ کہ اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت و ندرت اور وسعت و رنگارنگی ملتی ہے۔ ان کی زبان اس عہد کے لحاظ سے نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چوں کہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں بھی در آئی ہیں۔ اس کے باوجود ادبی روایت میں اس کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی 'قطب مشتری' کے مقدمے میں لکھا ہے:

> ''اس اعتبار سے 'قطب مشتری' قدیم ہے اور اس زمانے کا ایسا مرتب کلام کم ملتا ہے، قابلِ قدر ہے۔''
>
> (مولوی عبدالحق، قطب مشتری، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۳۹ء، ص:۳۰)

13.3.4 ماحصل

ملا وجہی قطب شاہی دور کے بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر و نثر نگار ہیں۔ ان کے آبا و اجداد اصلاً خراسان کے باشندہ تھے۔ 'حیاتِ وجہی' کے مصنف م۔ن۔ سعید کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آبا و اجداد ۹۷۳ھ کے قریب اپنے وطن سے ہجرت کر کے گول کنڈہ آئے تھے۔ ملا وجہی کی پیدائش کے سلسلے میں بیش تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰-۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ وہ گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام اسداللہ تھا۔ شاعری میں انھوں نے اپنے لیے کئی تخلص استعمال کیے ہیں لیکن عوام و خواص میں ان کے تخلص 'وجہی' کو شہرت ملی۔ ملا وجہی کے آبا و اجداد علم و ادب کے زیور سے آراستہ تھے۔ ملا وجہی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں فارغ البالی اور خوش حالی تھی۔ اسی خوش گوار ماحول اور دکنی تہذیب و تمدن میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ ملا وجہی کو شعر و ادب سے بچپن سے دل چسپی تھی لیکن انھیں شہرت قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہو کر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء میں ان کی وفات ہوئی اور برہنہ شاہ کی درگاہ کے احاطے میں ان کے مدفون ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ ملا وجہی نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی مشہور ترین تصنیفات میں 'سب رس'، 'قطب مشتری'، 'تاج الحقائق' اور فارسی دیوان شامل ہیں۔ 'قطب مشتری' ان کی مشہور مثنوی ہے جس میں انھوں نے بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کی داستان عشق کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت و ندرت اور وسعت و رنگا رنگی ملتی ہے۔ ان کی زبان اس عہد کے لحاظ سے نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چوں کہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں بھی در آئی ہیں۔ اس کے باوجود یہ مثنوی اُردو کی ادبی روایت میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- ملا اسداللہ وجہی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- ملا اسداللہ وجہی کے ادبی کارناموں سے آگہی حاصل کی۔
- ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' سے بحث کی۔
- ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کی خصوصیات و امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔
- اُردو مثنوی نگاری میں ملا اسداللہ وجہی کے مقام و مرتبے کو سمجھا۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ ملا وجہی کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ ملا وجہی اور قلی قطب شاہ کے مابین تعلقات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

۳۔ ملا وجہی کی شعری ونثری تخلیقات کے نام بتائیے۔

۴۔ 'سب رس' کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۵۔ ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کی خصوصیات وامتیازات سے بحث کیجیے۔

13.6 سوالوں کے جوابات

ا۔ ملا وجہی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی مثنوی 'قطب مشتری' سے پتا چلتا ہے کہ ان کے آباواجداد اصلاً خراسان کے باشندہ تھے۔ 'حیاتِ وجہی' کے مصنف م۔ ن۔ سعید کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آباواجداد ۹۷۳ھ کے قریب اپنے وطن سے ہجرت کر کے گول کنڈہ آئے تھے۔ وجہی کا اصل نام اسداللہ اور تخلص وجہی تھا۔ ملا وجہی کی پیدائش کے سلسلے میں بیش تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ وہ گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء ان کا سن وفات ہے۔ جس سے بیش تر محققین نے اتفاق کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے 'تذکرہ مخطوطات' جلد چہارم میں لکھا ہے کہ ملا وجہی رُوحانی طور پر سید حسن برہنہ شاہ کے معتقد تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے امیر مالک پرست خان نے برہنہ شاہ کی درگاہ کی تعمیر مکمل کی تھی۔ اسی درگاہ کے احاطے میں اسداللہ وجہی کے دفن ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

۲۔ قلی قطب شاہ سے ملا وجہی کی قربت کا اظہار ان کی شاہ کار مثنوی 'قطب مشتری' میں ہوا ہے۔ ملا وجہی نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن انھیں شہرت قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہو کر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ وہ بادشاہ کے ہر رزم و بزم میں شریک رہے۔

۳۔ ملا وجہی کی شعری ونثری تخلیقات میں 'قطب مشتری'، 'سب رس' اور 'تاج الحقائق' جیسی مشہور کتابوں کے علاوہ 'ماہ سیما و پری رخ'، 'صراط المستقیم فی دین قویم' فارسی دیوان اور دکنی غزلیں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو دستیاب ہیں۔

۴۔ ملا وجہی کی مشہور تصنیف 'سب رس' ایک تمثیلی داستان ہے۔ یہ کتاب انھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کتاب کو اُردو میں غیر مذہبی نثر کا سب سے پہلا مکمل نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملا وجہی نے اس کتاب میں عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وجہی نے اس کتاب میں نظم و نثر کو ملا کر ایک جدید طرز ایجاد کی ہے۔ اس کتاب پر ملا وجہی کو بہت فخر تھا۔

۵۔ ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' میں فنی لحاظ سے کئی خوبیاں ہیں۔ اس مثنوی کے مکالمے اور کرداروں کی باہمی گفتگو نہایت مناسب، برجستہ اور برمحل ہے۔ وجہی نے کرداروں کے معاشرتی رتبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان سے مکالمے ادا کروائے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت کرداروں کی جذبات نگاری ہے۔ وجہی نے انسانی نفسیات اور جذبات کی فطری عکاسی کر کے مثنوی میں جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ منظر نگاری کے معاملے میں بھی اس مثنوی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وجہی نے داستان عشق کے پس منظر میں اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی جھلک بھی پیش کی ہے۔ اس عہد کے دربار، توہمات، عقائد، اقدار، روایات اور سامانِ آرائش وزیبائش کے علاوہ متعدد معاشرتی اور تمدنی تفصیلات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں سلاست، روانی اور متانت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وجہی نے ثقیل الفاظ سے گریز کیا ہے اور فارسی، عربی اور ہندی الفاظ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے محاورے، روزمرہ، تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کو بہت ہنرمندی سے برتا ہے۔ اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت وندرت اور وسعت ورنگارنگی ملتی ہے۔ ان کی زبان اس عہد کے لحاظ سے نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چوں کہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں در آئی ہیں۔ اس کے باوجود ادبی روایت میں اس مثنوی کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔

13.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
ورثہ	:	میراث، ترکہ
سند	:	ثبوت، دلیل، صداقت نامہ
فارغ البالی	:	خوش حالی، آسودگی
آفتاب نصف النہار	:	سورج، دوپہر کا سورج
تمثیل	:	کسی واقعہ کا مثالی انداز میں بیان، ایک صنف جس میں قصے کی دو سطحیں ہوتی ہیں، ایک خارجی، دوسری داخلی

رزمیہ	:	وہ قصے جن میں جنگ کے واقعات بیان کیے جائیں، جنگ سے متعلق کہانیاں
جان فشانی	:	سخت محنت، انتہائی کوشش
طربیہ	:	وہ تحریر جس سے دل میں طرب یعنی خوشی کا احساس پیدا ہو
مافوق الفطرت	:	جو فطری قوتوں سے بالاتر قوتوں کا نتیجہ ہو اور علت و معلول کے قانون سے آزاد ہو
عجیب الخلقت	:	حیرت انگیز بناوٹ کا، انوکھی شکل کا
حصار	:	گھیرا، حلقہ، بلا اور آسیب سے محفوظ رہنے کے لیے ایک طرح کا ٹوٹکا
اسم اعظم	:	خدائے تعالیٰ کا سب سے بڑا نام
توہمات	:	توہم کی جمع، وہم، گمان، شک، شبہ، وہم میں پڑنا
طلسماتی	:	طلسمات سے منسوب، جادوئی
وقیع	:	بلند مرتبے والا، ذی عزت، ذی وقار
راکشس	:	دیو، شیطان
ملعون	:	قابل لعنت، پھٹکارا ہوا
ندرت	:	نیا پن، اچھوتا

13.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ حیاتِ وجہؔی : ڈاکٹر م۔ن۔سعید

۲۔ قطب مشتری (مرتبہ) : ڈاکٹر مولوی عبدالحق

۳۔ ملا وجہؔی (مونوگراف) : ڈاکٹر جاوید وشسشٹ

۴۔ قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ : پروفیسر وہاب اشرفی

۵۔ اُردو کی تین مثنویاں : پروفیسر خان رشید

۶۔ ملا وجہؔی اور انشائیہ: ایک تحقیقی مطالعہ : ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

اکائی 14 محمد نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد

14.2 تمہید

14.3 محمد نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ

14.3.1 محمد نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف

14.3.2 محمد نصرتی کے ادبی کارنامے

14.3.3 محمد نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' کا جائزہ

14.3.4 ماحصل

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

14.6 سوالوں کے جوابات

14.7 فرہنگ

14.8 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- محمد نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف سے واقف ہوں گے۔
- محمد نصرتی کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔
- محمد نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سے بحث کریں گے۔
- محمد نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- اُردو مثنوی نگاری میں محمد نصرتی کے مقام ومرتبے کو سمجھیں گے۔

14.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار ملا وجہی کے سوانحی احوال وکوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' کی خصوصیات وامتیازات اور اس کی فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے اہم مثنوی نگار نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف اور ان

کے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' سے بحث کریں گے اور اس کی فنی خوبیوں سے آگاہ ہوں گے۔ ساتھ ہی اُردو مثنوی نگاری میں ان کے مقام ومرتبے کو سمجھیں گے۔

14.3 محمد نصرت نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ

14.3.1 محمد نصرت نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف

نصرتی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ 'محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن' میں ان کا نام 'محمد نصرت' درج ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نام کی مناسبت سے اسے قرین قیاس کہا ہے لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نام 'محمد نصرت' ہی تھا۔ گارساں دتاسی نے نصرتی کو برہمن خاندان کا چشم و چراغ بتایا ہے جب کہ مولوی عبدالحق نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کئی نسلوں سے مسلمان اور اسلامی تعلیمات کے ماننے والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ گیسو دراز کی مدح میں کہے گئے ان کے اس شعر سے ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بحمد اللہ کرسی بہ کرسی مری   چلی آئی ہے بندگی میں تری

نصرتی کے آباواجداد کے بارے میں بھی وافر معلومات موجود نہیں ہیں۔ البتہ نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشن عشق' میں اپنے آبا کے بارے میں جو اشعار نظم کیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباواجداد پیشہ ور سپاہی تھے۔ وہ اصلاً دکن کے باشندہ نہ تھے بلکہ یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ شاعری نصرتی کا موروثی پیشہ نہ تھا بلکہ وہ اپنے خاندان کے پہلے شاعر تھے۔ اس کا ثبوت ان کے درج ذیل شعر سے ملتا ہے جو 'علی نامہ' میں موجود ہے۔

اے شاہ رتن کا کھن ہوا مجھ من سو تیرا فیض ہے   کچھ کسب موروثی نہ ہوئی حقا کہ مجھ یو شاعری

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ نصرتی کے بارے میں تذکروں میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں لیکن انھوں نے اپنی مثنویوں میں اپنے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ شاہی کے عہد کی نامور شخصیات میں سے قاضی سید کریم اللہ، شاہ ابوالمعالی اور شاہ نوراللہ وغیرہ ان کے خاص احباب تھے۔ نصرتی کی ابتدائی تعلیم وتربیت پر ان کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علوم متداولہ اور مروجہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل

کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ محمد ابراہیم صاحب بیجاپوری نے 'روضۃ الاولیا' میں شیخ نصرتی کے بھائی شیخ منصور کے حالات کے ضمن میں جو باتیں تحریر کی ہیں، اس سے نصرتی کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'روضۃ الاولیا' کے حوالے سے لکھا ہے:

''آپ کے دو برادر مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا اور شیخ عبدالرحمٰن سپاہی تھے۔ یہ ہر سہ برادرانِ حقیقی ہیں۔ ہر ایک صاحب ایک ایک فن میں کمال رکھتے تھے۔ شیخ منصور علمِ دعوت میں شیخ عبدالرحمٰن سپاہ گری میں اور شیخ ملا نصرتی شاعری میں۔ مولانا شیخ منصور اور شیخ عبدالرحمٰن دونوں کو اولاد صلبی نہیں ہے۔ مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا کو آل ہے، اولاد نہیں اور ان کی آل سے پانچ چادر والے، گھڑیال والے، منور والے، ہاشم پیر والے، گول سنگی والے، نگینہ باغ والے، ہم سا گر والے موجود ہیں۔''

(مولوی عبدالحق، نصرتی، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۲۔۱۳)

مولوی عبدالحق کے مطابق نصرتی کی اولاد اب تک موجود ہے۔ ان کی اولادِ نرینہ میں کوئی نہیں تھا البتہ ایک بیٹی تھی اور 'روضۃ الاولیا' کے مطابق اس کی اولاد سے ہی جعفر صاحب اور صاحب حسنی نگینہ باغ والے گول سنگی میں موجود ہیں۔ 'علی نامہ' کے چند اشعار اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ نصرتی کے دونوں بھائی ان کی حیات میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ نصرتی کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ نصرتی کی قبر بیجاپور کے نگینہ باغ میں ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق یہ زمین اب گورنمنٹ ہائی اسکول کے احاطے میں ہے۔ نصرتی نے عادل شاہی سلطنت کے تین بادشاہوں؛ محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ اور سکندر عادل شاہ کا دورِ حکومت دیکھا تھا۔ بہ طور شاعر وہ محمد عادل شاہ کے دورِ حکومت میں ہی دربار میں جگہ پا چکے تھے۔ ان کا 'قصیدۂ چرخیہ' اسی دور کی یادگار ہے جس کی فنی خوبیوں اور کلام کی روانی و شیرینی کو ناقدینِ فن نے خوب سراہا ہے لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جلوہ علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے دور میں زیادہ نمایاں ہوا۔ شاہیؔ بچپن سے نصرتی کو عزیز رکھتے تھے۔ علی عادل شاہ سے ان کی قربت اور محبت کا اظہار ان کی بہت سی تخلیقات میں ہوا ہے۔ جب وہ بادشاہ بنے تو نصرتی بھی دربارِ شاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بلا بھیج بندے کو اس حال میں نظر کر مرے بے بہا مال میں

پرکھتا چلیا یو رتن سر بسر　　تھکے دیکھ پارکھ یو اہل نظر

وہیں جگ میں بندہ رہنے بے نیاز　　رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں لکھا ہے کہ ''علی عادل شاہ شاہی نہ صرف مربی اور سرپرست تھا بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے''۔ اس کا اظہار نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشن عشق' میں بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ''اسے نصرتی کی شاہی عقیدت مندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا''۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے یو سخن بادشاہ یاد ہے　　پچھے پیر کے وصف استا ہے

مج استاد 'استاد عالم' اچھے　　جتا علم ازبر جسے جسم اچھے

بحمد اللہ یہ کیا بڑے بخت آج　　نہ استاد کوئی مج علی شہ کے باج

نصرتی علی عادل شاہ ثانی شاہی کے شاگرد رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی قربت اور توجہ نے نصرتی کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور انھیں وہ ماحول فراہم کیا جس میں وہ بے فکری کے ساتھ تخلیقی کام انجام دے سکے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی مشہور مثنویاں 'گلشن عشق' اور 'علی نامہ' اسی دور کی یادگار تصانیف ہیں۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی نے ہی انھیں ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ شاہی کے بیٹے سکندر عادل شاہ کے دور میں نصرتی نے 'تاریخ اسکندری' قلم بند کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریاض حسنی' کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب 'ملک الشعرائے ہند' سے سرفراز فرمایا۔''
>
> (مولوی عبدالحق، نصرتی، ص: ۱۸)

14.3.2 محمد نصرت نصرتی کے ادبی کارنامے

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ وہ عادل شاہی دور کے

بلند پایہ اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی، قصیدہ، غزل اور رُباعی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور کئی اہم تخلیقات سے اُردو ادب کا دامن بھر دیا۔ اُردو شاعری خصوصاً اُردو مثنوی کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ 'گلشن عشق'، 'علی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری' ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا شعری کلام بھی یادگار ہے جس میں قصائد و غزلیات اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔ 'گلشن عشق' نصرتی کی ایک عشقیہ مثنوی اور سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کا شمار اُردو کی چند بڑی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ نصرتی کی یہ مثنوی ان کے ادبی قد کا شناخت نامہ ہے۔ اس مثنوی کے مرکزی قصے کی بنیاد قدیم لوک کہانی 'کنور منوہر اور مد مالتی' کی داستان عشق پر ہے۔ یہ داستان قدیم زبانی بیانیہ کا حصہ رہی ہے۔ فارسی میں بھی اس قصے کو کئی مصنفوں نے نظم کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق اس قصے کو شیخ منجھن نے بھی ہندی میں لکھا تھا لیکن نصرتی نے اپنی مثنوی میں اس قصے کو نظم کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ نصرتی کی اس مثنوی کا ہندوستانی رنگ و آہنگ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ پوری مثنوی میں مقامیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس میں تمام تر واقعات پر ہندو دیومالائی فضا غالب ہے۔ جادوٹونے کے زور کا دکھائی دینا، راون کے دس سر، مہادیو کے چار ہاتھ، درگا کے دس ہاتھ، سرسوتی کے چار ہاتھ جیسی روایتوں کی موجودگی اور دوسرے روپ میں جنم لینے کے ہندو عقیدے کا ذکر، یہ سب ہندو دیومالا کے اثرات ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ نصرتی نے بہادری کی مثال پیش کرنے کے لیے کسی اسلامی روایت سے وابستہ ہستی کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اس کے لیے بھیم کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے گل و بلبل اور شمع و پروانے کی لفظیات سے زیادہ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک میں دل چسپی ظاہر کی ہے۔ مد مالتی کے حسن کی تصویر کشی کے لیے کنول، چمپا کلی، بھونرے، ہاتھی اور ہنس جیسے پھولوں اور جان داروں کے مخصوص اجزا و اعضا کا سہارا لیا ہے جن کا ہندوستان سے راست تعلق ہے۔ مثنوی 'گلشنِ عشق' کا موضوع محبوب کی تلاش ہے لیکن اس تلاش کے سفر میں ایک پُراسرار اور بھید بھری دنیا خلق ہوتی ہے۔ راجا فقیر کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتا ہے۔ پریاں راجا کا درد جانتی ہیں۔ اسے فقیر کا پتہ بتاتے ہوئے اپنے سر کا بال دیتی ہیں جو مصیبت میں کام آئے اور اپنے تخت پر بٹھا کر اسے فقیر کے غار تک چھوڑتی ہیں۔ پریوں کا بال دکھانے پر فقیر راجا کو پاس بلاتا ہے اور شریفے کے درخت سے پھل توڑ کر رانی کو کھلانے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ پھل کھا کر رانی حاملہ ہو جاتی ہے۔ یہاں نجومی کا کردار اور اس کی پیش گوئیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ سب کچھ مافوق فطرت مظہر و قوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ چھت پر سوئے ہوئے راج کمار کے حسن سے پریوں کا متاثر ہونا اور اس کے لیے نو پریوں کا خوب صورت لڑکی کی تلاش میں نکلنا، پریوں کا راج کمار کے پلنگ کو اٹھانا اور اسے مد مالتی کے پلنگ کے پاس رکھ دینا یا پھر راج کمار کی آنکھوں میں پریوں کا سلائی کو ڈال دینا تاکہ وہ کسی کو نظر نہ آئے، یہ سب کچھ مافوق فطری عناصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'گلشن عشق' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی جذبات کی پرچھائیں جا بہ جا رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور قدرتی مناظر کی جلوہ گری

دیکھنے کوملتی ہے۔ حمد، مناجات، نعت، خواجہ بندہ نواز کی تعریف وتوصیف، علی عادل شاہ کی مدح وستائش، عقل کی تعریف، حال کا بیان، عشق کی مدح، فقیر کی تصویرکشی، باغ کا منظرنامہ، طلوع آفتاب اورصبح کے مناظر کی مرقع کشی، چاندنی کی دل کش کیفیت اوراس کے حسن کا بیان، ہجروفراق کی کیفیت، موسم سرما، برف باری، مسافرت کے ماحول کی منظرکشی، جہاز کے سفر کا حال، شادی بیاہ کا منظر، کھانوں کی تفصیل، باغ اور پرندوں کی کیفیت، تمازت اور دھوپ کا بیان، یہ سب کچھ اس مثنوی میں موجود ہے۔ اس مثنوی کو پڑھ کر نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔

نصرتی کی دوسری اہم ترین مثنوی 'علی نامہ' ہے۔ ان کی تیسری مثنوی 'تاریخ اسکندری' ہے۔ اس کا اصل نام 'فتح نامہ بہلول خاں' ہے جس کی تکمیل ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۲ء میں ہوئی۔ نصرتی نے یہ مثنوی علی عادل شاہ کی وفات کے بعد لکھی جو عہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ ہے۔ یہ نصرتی کے اس دور کا کلام ہے جب بیجاپور کی سلطنت انحطاط کا شکار تھی۔ اس میں انھوں نے اس وقت کے بیجاپور میں نفاق ومخالفت کی گرم بازاری کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ ایک مختصر رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں صرف ۱۵۵۴ اشعار ہیں۔ اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فکروفن کے اعتبار سے اس میں وہ زوراور شگفتگی نہیں پائی جاتی جو 'علی نامہ' اور 'گلشن عشق' میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتی کی اس مثنوی کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جو ان کی دوسری مثنویوں کو حاصل ہوئی۔ ایک ممتاز مثنوی نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محمد نصرت نصرتی کا شمار قادرالکلام غزل گوشعرا میں بھی ہوتا ہے۔ ان کی غزل کا موضوع عورت ہے جس سے وہ ہم کلام ہوتے ہیں اور اپنے عشقیہ جذبات واحساسات کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ریختی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثنوی اور غزل کے علاوہ ان کے دیوان میں رُباعیات وقصائد بھی ملتے ہیں۔ بعض ماہرین کے مطابق نصرتی نے نوقصیدے تحریر کیے ہیں جب کہ پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتی نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ مثنوی 'علی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ نصرتی نے اپنے سلطان علی عادل شاہ کی مدح میں علاحدہ ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ ان کا قصیدہ 'پنالہ گڑھ' ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ہے جس کا آغاز علی عادل شاہ ثانی کی مدح سے ہوتا ہے۔ اس قصیدے میں گریز کے شعر کے بعد نصرتی نے شیواجی کی مذمت میں اشعار کہے ہیں جو قلعہ پنالہ کی جنگ میں بادشاہ کا حریف تھا۔ قصیدہ 'فتح ملنار' کا آغاز بھی بادشاہ کی مدح کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ قصیدہ ۲۲۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کو نصرتی نے 'بے بدل' قصیدہ قرار دیا ہے:

سنو یک فتح کا شہہ کے قصیدہ بے بدل یارو　　　کہ ہر یک مختصر مضمون دھرے معنی مطول کا

اس قصیدے میں نصرتی نے ایک بہاریہ مطلع کہنے کے بعد باغ کی آرائش وتزئین کے بارے میں ۱۲۹ اشعار کہے ہیں۔ خوب صورت تشبیہات اور صنائع وبدائع کا استعمال اس قصیدے کی جان ہے۔ حالاتِ جنگ، دشمنوں کی

ہار، فتح شاہ اور جشن فتح کی مکمل منظر کشی اس قصیدے میں ملتی ہے۔ معراج کے بیان میں ایک طویل قصیدہ ان سے یادگار ہے۔ اس قصیدے کے آخر میں انھوں نے محمد عادل شاہ کی مدح و ستائش میں بھی اشعار قلم بند کیے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ 'عاشورہ کے بیان میں' ہے۔ اس قصیدے میں تشبیب کے اشعار کے بعد حمد، نعت اور منقبت کے اشعار ہیں۔ شہادت کا ذکر بھی اس قصیدے کا حصہ ہے۔ تشبیہات و استعارات کے حسین استعمال اور حسن بیان نے اس قصیدے کو عظیم بنا دیا ہے۔ ان کا قصیدہ 'فتح بادشاہ غازی' ۵۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے دیگر قصیدوں میں 'بادشاہ غازی بیجاپور کو آنے کا' اور 'قصیدہ فصل زمستان' کا ذکر ملتا ہے۔ نصرتی نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجویہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔ ایک گھوڑے کی مذمت میں لکھا ہوا ان کا قصیدہ قابلِ ذکر ہے۔ ناقدینِ فن نے لکھا ہے کہ ان کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسم سرما یا ٹھنڈ کالے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الٰہی 'سعدی کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے'۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ معراجِ نبوی کے بیان میں ہے۔ معراج اسلامی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے اور اُردو شاعری میں اس واقعہ کا اس قدر مکمل اور تفصیلی بیان اس قصیدے کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ اس قصیدے کے تمہیدی اشعار کا تعلق فلکیات سے ہے۔ نصرتی کے اس قصیدے کو ناقدین نے چرخیات میں شمار کیا ہے۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی البتہ 'علی نامہ' میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔ نصرتی کے قصیدوں میں صنف قصیدہ کی تمام اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شوکتِ لفظی اور زورِ بیان ان کے قصائد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ مدح پر ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں تشبیب کے اشعار بہت مختصر ہوتے ہیں۔ وہ بھی قلی قطب شاہ کی طرح قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ عموماً ان کے قصیدے مدح سے شروع ہوتے ہیں جیسے فتح پنالہ والے معرکۃ الآرا قصیدے کے آغاز میں ہی وہ بادشاہ کی تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔ نصرتی کو دکن کا سب سے اہم قصیدہ نگار مانا جاتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں نصرتی کے قصیدوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''نصرتی کے قصائد اپنے تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور شوکت لفظی کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں اور پھر خیالات کی جدت اور تشبیہہ اور استعارات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی زورِ بیان سے بھی خالی نہیں۔''

(نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۲۱۵)

نصرتی کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے۔ اکثر ماہرین ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اُردوئے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔ بادشاہ کی تلوار کی تعریف میں ان کا یہ شعر دیکھیے:

جب تے جھلک دیکھا اوک سورج تری تروار کا　　　تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پُر عرق یکبار کا

دکنی قصیدوں میں مذہبی موضوعات بہ کثرت ملتے ہیں۔ زیادہ تر مذہبی موضوعات کا تعلق حمد، نعت یا منقبت سے رہا ہے۔ نصرتی نے بھی نے ایک قصیدہ مجلس عاشورہ سے متعلق تحریر کیا ہے جس میں رثائی عنصر موجود ہے۔ اس لیے موضوعاتی سطح پر اس قصیدے کو مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ دکنی قصیدوں میں مدحیہ اشعار تو بہ کثرت ملتے ہیں تاہم رثائیہ قصیدے نہیں ملتے۔ حالاں کہ عربی و فارسی میں اس طرح کے قصائد موجود ہیں۔ نصرتی نے ابتدائی دور میں ہی اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ نصرتی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہجویہ قصیدہ بھی تحریر کیا ہے۔ اپنے ہجویہ قصیدے میں انھوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کا فخریہ بیان کیا ہے جب کہ اپنے مخالفین کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے انھیں ہرزہ گویاں، خام طفلاں، خنثیٰ، غبی، خر، منافق، پتھر، کتیا، کور طبعاں اور کم ذات جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ نصرتی کے قصائد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قصائد میں ربط و تسلسل، مقامیت، ارضیت، پر شکوہ بیان، عمدہ اور سلیس زبان، جوش بیان، دل کش تشبیہات و استعارات، تلمیحات و اساطیر، عربی و فارسی لفظوں کا برمحل استعمال، رزمیہ عناصر، منظر کشی، واقعات نگاری اور تاریخی حقیقت نگاری جیسی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے قصیدوں کی ان ہی خوبیوں کے سبب انھیں دکن کا سب سے بلند پایہ قصیدہ گو شاعر قرار دیا گیا ہے۔ بعض ماہرین ادب نے بہ حیثیت قصیدہ نگار ان کو سوداؔ اور ذوقؔ کی صف میں کھڑا کیا ہے۔

14.3.3 محمد نصرت نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' کا جائزہ

نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' اُردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اسے نصرتی کا شاہ کار بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا ذکر تفصیل سے موجود ہے جو جنگ انھوں نے مراٹھوں، حبشی سرداروں اور مغلوں کی فوج سے لڑی تھی۔ علی عادل شاہ جب تخت نشین ہوئے تو ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی مگر انھوں نے بیک وقت سلطنت کے بدخواہ اور منافق امرا کی سازشوں کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے باہری طاقتوں کی محاذ آرائی کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کم سنی کے باوجود اپنی ہمت و حوصلے سے وہ اپنی سلطنت کو ان سبھی مشکلات سے نکالنے میں کام یاب رہے۔ نصرتی نے ان تمام تر تفصیلات کو 'علی نامہ' میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اُردو کی ایک اہم رزمیہ مثنوی ہے۔ اُردو میں رزمیہ یا تاریخی و سوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی

ہیں۔ دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹے ہوئے نظر نہیں آتی۔ شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ضرور ہو جاتی تھی۔ ساتھ ہی بعض اوقات بادشاہِ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال ضرور رقم ہو جاتے تھے لیکن جو بھی مثنویاں رزمیہ موضوعات پر ملتی ہیں، ان میں نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ اس مثنوی میں بیجاپور پر مغلوں اور شیواجی کی قیادت والے مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے حملوں کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق نصرتی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ مثنوی کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت اور بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے اس جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کا ثبوت 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح و کامرانی کی سرشاری، شکست و ریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی و سخاوت اور رعایا پروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی اُردو زبان کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس مثنوی پر مبسوط تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حسنِ بیان اور زورِ کلام کے تمام اسلوب ہوتے ہوئے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا۔ تاریخ سے واقعات کو ملا لیجیے کہیں فرق نہ پایئے گا بلکہ بعض باتیں شاید ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے۔ باوجود اس کے واقعات کی تفصیل، مناظرِ قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمالِ فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے۔ اُردو زبان یوں ہی رزمیہ نظموں سے خالی ہے اور ایک آدھ رزمیہ نظم جو اس سے قبل لکھی گئی ہے، وہ ہرگز اس کو نہیں پہنچتی۔ یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے۔''
>
> (مولوی عبدالحق، نصرتی، ص: ۷٦)

نصرتی نے اس مثنوی میں حمد، مناجات، نعت اور پھر سلطان کی مدح پیش کی ہے جو روایتی مثنویوں کا طریقہ رہا ہے۔ انھوں نے حمدیہ اشعار کو موضوع کی مناسبت سے رزمیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اللہ کے نظامِ عدل اور اس کی طاقت و قدرت کا بیان حمدیہ اشعار سے شروع کرتے ہوئے کہا ہے کہ تلوار کے بغیر امن و صلح نہیں ہو سکتی اور

خدا نے جس کو بھی عظمت و بلندی عطا کی ہے، اسے اس کے تحفظ کے لیے ہتھیار سے بھی نوازا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار دیکھیے:

لوہے کوں کیا توں سفر کا رفیق | لوہا نیں تو زر دشمن ہر طریق
لوہے بن نکوی یا جانی ہے ہور | لوہے تھیج ہے یار جانی کوں زور

'علی نامہ' میں بھی 'گلشن عشق' کی طرح ہر باب کے عنوان کا آغاز ایک شعر سے ہوا ہے۔ اس شعر سے اس باب کے موضوعات ومسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ چوں کہ عنوانات کے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں، اس لیے بقول مولوی عبدالحق ''اگر انھیں ایک ساتھ جمع کر دیا جائے تو ایک لامیہ قصیدہ بن جائے گا''۔ عنوان کے طور پر مذکور دو شعر ملاحظہ کیجیے:

حمد اول ہے خدا کا کہ جنے روز ازل | دیا ہے ہمتِ مرداں کو جو توفیق سوں بل
رکھا اس نامۂ نامی کا علی نامہ نانوں | تا جنم جگ یو زمانے کے گلے ہوئے ہیکل

نصرتی نے 'علی نامہ' لکھنے کے اسباب اور اس کے اغراض ومقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی اپنے کلام کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے اس پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ جس زبان میں یہ کلام پیش کر رہے ہیں، ابھی اس کا عہدِ طفلی ہی چل رہا ہے لیکن انھیں فخر تھا کہ انھوں نے اس زبان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

مثنوی 'علی نامہ' میں علی عادل شاہ کی تخت نشینی کا جشن، جشن کے موقع پر شہر کی آرائش وسجاوٹ اور رعایا نیز درباریوں کی خوشی ومسرت کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے۔ نصرتی اپنے بادشاہ کی عقل مندی اور بہادری کی جگہ جگہ تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے تخت نشینی کے بعد ابتدائی دنوں میں بھی حکومت کے خلاف ہونے والی اندرونی سازشوں اور بیرونی محاذوں سے نمٹنے میں کمالِ ہنرمندی اور بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ضمن میں کہے گئے ان کے چند اشعار دیکھیے:

اگن پن وہ فتنے کی چوندھیر سوں | اٹھی تھی وو شمشیر کے نیر سوں

اسے یک طرف تھے بجاویں تلگ　　　اٹھے بھی وہ دسرے رخن تھے سلگ

بزرگی جسے ات خداداد ہے　　　دل اس کا نبڑپن میں پولاد ہے

مثنوی 'علی نامہ' کا مدحیہ حصہ بہت اہم ہے۔ مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی منظر کشی عینی شاہد کی طرح کی ہے۔ 'علی نامہ' میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات و استعارات کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔ مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادروں کی نبرد آزمائی، گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری نہیں کی ہے۔

14.3.4 ماحصل

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ محققین کے مطابق ان کا نام 'محمد نصرت' ہے۔ بعض محققین نے ملا نصرتی بھی لکھا ہے۔ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ان کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علوم متداولہ اور مروجہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ان کو کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی البتہ ایک بیٹی تھی۔ ان کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی قبر بیجاپور کے نگینہ باغ میں ہے۔ نصرتی عادل شاہی دور کے بلند پایہ اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی، قصیدہ، غزل اور رُباعی جیسی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور کئی اہم تخلیقات سے اُردو ادب کا دامن بھر دیا۔ اُردو شاعری خصوصاً اُردو مثنوی کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ 'گلشن عشق'، 'علی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری' ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا شعری کلام بھی یادگار رہے جس میں قصائد و غزلیات اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔ ان کی مثنوی 'علی نامہ' اُردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۰۷۶ھ میں منظرِ عام پر

آئی۔اس مثنوی میں بیجاپور پر مغلوں اور شیوا جی کی قیادت والے مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے حملوں کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔مثنوی کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت اور بہادری میں بے نظیر تھا۔نصرتی نے اس جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کا ثبوت 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح وکامرانی کی سرشاری، شکست وریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی وسخاوت اور رعایا پروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی اُردو زبان کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔اس مثنوی کا مدحیہ حصہ بہت اہم ہے۔مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کام یابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی منظر کشی عینی شاہد کی طرح کی ہے۔'علی نامہ' میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات واستعارات کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادروں کی نبرد آزمائی، گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری نہیں کی ہے۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- محمد نصرت نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- محمد نصرت نصرتی کے ادبی کارناموں سے آگہی حاصل کی۔
- محمد نصرت نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سے بحث کی۔
- محمد نصرت نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- اُردو مثنوی نگاری میں محمد نصرت نصرتی کے مقام ومرتبے کو سمجھا۔

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ نصرتی کے سوانحی احوال وکوائف سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

۲۔ نصرتی اور علی عادل شاہ ثانی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ نصرتی نے کتنے قصیدے اور مثنویاں تحریر کی ہیں؟

۴۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کی اشاعت کب ہوئی اور اس کا موضوع کیا ہے؟

۵۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کی خصوصیات و امتیازات سے مختصراً بحث کیجیے۔

14.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ نصرتی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ محققین کے مطابق ان کا نام 'محمد نصرت' ہے۔ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ان کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علوم متداولہ اور مروجہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ان کو کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی البتہ ایک بیٹی تھی۔ ان کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی قبر بیجاپور کے نگینہ باغ میں ہے۔

۲۔ نصرتی نے عادل شاہی سلطنت کے تین بادشاہوں؛ محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کا دورِ حکومت دیکھا تھا۔ بہ طور شاعر وہ محمد عادل شاہ کے دورِ حکومت میں ہی دربار میں جگہ پا چکے تھے۔ ان کا 'قصیدۂ چرخیہ' اسی دور کی یادگار ہے جس کی فنی خوبیوں اور کلام کی روانی و شیرینی کو ناقدینِ فن نے خوب سراہا ہے لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جلوہ علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دور میں زیادہ نمایاں ہوا۔ شاہی بچپن سے نصرتی کو عزیز رکھتے تھے۔ علی عادل شاہ سے ان کی قربت اور محبت کا اظہار ان کی بہت سی تخلیقات میں ہوا ہے۔ جب وہ بادشاہ بنے تو نصرتی بھی دربارِ شاہ تک پہنچنے میں کام یاب ہوئے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں لکھا ہے کہ ''علی عادل شاہ شاہی نہ صرف مربی اور سرپرست تھا بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے''۔ اس کا اظہار نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشنِ عشق' میں بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ''اسے نصرتی کی شاہی عقیدت مندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا''۔

۳۔ بعض محققین کے مطابق نصرتی نے نو قصیدے تحریر کیے ہیں جب کہ پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتی نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ ان کی مثنوی 'علی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ 'گلشنِ عشق'،

'علی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری' ان کی تین یادگار مثنویاں ہیں۔

۴۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' ۱۰۷۶ھ میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں بیجاپور پر مغلوں اور شیواجی کی قیادت والے مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے حملوں کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں جو اس مثنوی کا موضوع ہیں۔

۵۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' اُردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۰۷۶ھ میں منظرِ عام پر آئی۔ اسے نصرتی کا شاہ کار بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا ذکر تفصیل سے موجود ہے جو جنگ انھوں نے مراٹھوں، حبشی سرداروں اور مغلوں کی فوج سے لڑی تھی۔ علی عادل شاہ جب تخت نشین ہوئے تو ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی مگر انھوں نے بیک وقت سلطنت کے بدخواہ اور منافق امرا کی سازشوں کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے باہری طاقتوں کی محاذ آرائی کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کم سنی کے باوجود اپنی ہمت و حوصلے سے وہ اپنی سلطنت کو ان سبھی مشکلات سے نکالنے میں کام یاب رہے۔ نصرتی نے ان تمام تر تفصیلات کو 'علی نامہ' میں بڑے ہی دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق نصرتی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ اس مثنوی کا مدحیہ حصہ بہت اہم ہے۔ مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کام یابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی منظر کشی عینی شاہد کی طرح کی ہے۔ 'علی نامہ' میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات و استعارات کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔ مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادروں کی نبرد آزمائی، گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری نہیں کی ہے۔

14.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
مربی	:	پالنے، پرورش کرنے والا، سرپرست
وافر	:	افراط، کثیر
شجاعت	:	بہادری
علوم متداولہ	:	مروج علوم، وہ علوم جو عام طور سے اپنے عہد میں رائج ہوں
محمول	:	گمان کیا گیا، قیاس کیا گیا
انکسار	:	فروتنی، خاکساری، عاجزی
دیومالا	:	خیالی کہانیاں، دیوتاؤں کے قصے
پُراسرار	:	پوشیدہ، چھپا ہوا، نا معلوم، جس میں کچھ راز یا بھید ہو
نجومی	:	ستاروں کا علم رکھنے والا، جیوتشی
رزمیہ	:	جنگ سے متعلق
انحطاط	:	زوال، پستی، تنزلی
ابھال	:	بادل
اتھا	:	تھا
اندھاری	:	اندھیرا
پند	:	نصیحت
پولاد	:	فولاد، لوہا
رتن	:	جواہرات، قیمتی پتھر، نگ
نبرد آزمائی	:	لڑائی، مقابلہ، جنگ

14.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

۲۔ نصرتی (مؤلفہ) : مولوی عبدالحق

۳۔ تاریخِ ادبِ اُردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن کی تدریس و تفہیم	۴۔	اُردو مثنوی کا ارتقا	:	پروفیسر عبدالقادر سروری
	۵۔	اُردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)	:	سید محمد عقیل رضوی
	٦۔	دیوان نصرتی (مرتبہ)	:	ڈاکٹر جمیل جالبی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 15 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ

ساخت

15.1 اغراض و مقاصد

15.2 تمہید

15.3 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ

15.3.1 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف اور ادبی کارنامے

15.3.2 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ

15.3.3 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے فنی محاسن

15.3.4 ماحصل

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

15.6 سوالوں کے جوابات

15.7 فرہنگ

15.8 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' سے بحث کریں گے۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے فنی محاسن سے آگاہ ہوں گے۔
- اُردو مثنوی نگاری میں شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے مقام و مرتبے کو سمجھیں گے۔

15.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کے تجزیے کے ذریعے ان کی مثنوی نگاری

کی فنی خصوصیات کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'پھول بن' سے بحث کریں گے اور اس کے فنی محاسن سے آگاہ ہوں گے۔ ساتھ ہی اُردو مثنوی نگاری میں ان کے مقام و مرتبے کو سمجھیں گے۔

15.3 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ

15.3.1 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف اور ادبی کارنامے

شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ابن نشاطی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مثنوی 'پھول بن' میں موجود داخلی شہادتوں سے ابن نشاطی کے حالاتِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثنوی 'پھول بن' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابن نشاطی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاطی تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاطی تخلص اختیار کیا۔ ابن نشاطی کے خاندان اور ان کی پیدائش کے متعلق بھی وافر معلومات نہیں ملتی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے اور ان کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ فن بلاغت اور خاص طور پر علم معانی و بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ مثنوی 'پھول بن' ابن نشاطی کی شخصیت کے کئی پہلوؤں اور ان کے انداز فکر و نظر کے کئی گوشوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں کے برعکس شیخی کے بجائے عاجزی و انکساری سے کام لیتے ہیں، وہ اپنے حریفوں کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے، وہ معاصرین کے بجائے پیش روؤں سے اپنے کلام کی داد چاہتے ہیں۔ وہ اپنے پیش روؤں میں فیروزؔ، محمودؔ، خیالیؔ اور حسن شوقیؔ کے کمالات کے معترف تھے۔ دراصل ابن نشاطی نے ان ہی اساتذہ کرام کے اسلوب کی پیروی کی تھی۔ ان کو اندازہ تھا کہ ان کا تخلیقی اسلوب اگر کسی کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے تو وہ ان کے پیش روشعرا کا اسلوب ہے۔ اسی لیے انھوں نے ان کے نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے شاعر تھے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ خود باکمال شاعر تھے جو فارسی زبان میں عمدہ شعر کہتے تھے۔ انھیں موسیقی میں بھی کامل مہارت حاصل تھی۔ ان کے دربار سے وجہیؔ، غواصیؔ، ملک خوشنودؔ اور جنیدیؔ جیسے ممتاز شعرا وابستہ رہے۔ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے اعتبار سے یہ زریں عہد رہا ہے۔ یہ وہ عہد تھا جس میں دربار

اور دربار سے باہر بھی شعروسخن کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں اور ہر طرف شعروسخن کا چرچا تھا۔ اس دور میں صنفِ غزل کو مرکزیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' میں مثنوی لکھنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر غزل نہیں کہی تو کوئی بات نہیں۔ انھوں نے دلیل دی ہے کہ آخر فردوسی اور نظامی نے کون سی غزلیں کہی ہیں؟ غزل کے برعکس نظم کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ اگر ہنر کا رتبہ دیکھنا ہے تو 'شاہنامہ' پڑھنا چاہیے:

غزل کا مرتبہ گرچہ اول ہے　　　ولے ہر بیت میرا ایک غزل ہے
غزل گر نیں کہے تو نیں ہے خامی　　　جو کچ بولے سو ظاہر ہے نظامی
غزل نیں طوس کے استاد کوں ایک　　　ہنر ازما کو شہنامہ منے دیک

ابن نشاطی نے مثنوی کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ زمانے کے چلن کے مطابق انھوں نے غزلیں بھی نہیں کہیں سوائے ایک غزل کے جو 'پھول بن' میں شامل ہے۔ بقول محمد اکبرالدین صدیقی:

''اس غزل کو پڑھ کر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر ابن نشاطی اس ذوق کو ترقی دیتا تو وہ اس دور کے بہترین غزل گو شعرا میں ہو سکتا تھا۔''

(محمد اکبرالدین صدیقی (مرتبہ)، 'پھول بن'، ابن نشاطی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص:۴۲)

ابن نشاطی کی سب سے مشہور مثنوی 'پھول بن' ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی جو ۱۷۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ ابن نشاطی کے مطابق اس کا ماخذ ایک فارسی قصہ 'بساتین الانس' ہے۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۰۶۶ھ بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے ۱۰۷۶ھ بھی لکھا ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مثنوی 'پھول بن' خالص ترجمہ یا تلخیص نہیں ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''مصنف نے قصے کے خاکے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کے اشخاص قصہ طرز معاشرت کے لحاظ سے اس کے عہد کے انسان ہیں۔ مثنوی میں جگہ جگہ قطب شاہی محلات اور باغوں سے جزئیات اخذ کیے گئے ہیں۔''

(پروفیسر عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء ص:۸۵،۸۶)

ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے ادبی شاہ کار ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ابن نشاطی نے اس مثنوی میں انتالیس صنعتوں کے استعمال کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔قدم قدم پر لفظی ومعنوی صنائع وبدائع کو بروے کار لا کر انھوں نے اپنی انشاپردازی کا پختہ ثبوت دیا ہے۔مثنوی 'پھول بن' کی سلاست وسادگی اور روانی جیسی خوبیاں پیش رو اساتذہ کے فارسی رنگ وآہنگ کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔یہ مثنوی فنی لطافت ودل کشی میں دکن کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ابن نشاطی کی ایک اور مثنوی 'طوطی نامہ' بھی ہے جو ہندوستان کا ایک مقبول قصہ ہے۔گارساں دتاسی نے اس کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ بیان کیا ہے لیکن شمس اللہ قادری نے 'اُردوئے قدیم' میں اسٹوارٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۶۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔یہ بخشی کی فارسی کتاب کا ترجمہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اس کا چربہ ہے۔ابن نشاطی اپنے عہد کے بے حد ممتاز اور باکمال شاعر تھے۔ان کی شاعرانہ عظمت کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'دکنی ادب کی تاریخ' میں لکھا ہے:

> ''ابن نشاطی اس دور کا ایسا صاحب کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدر دانی سے بے نیاز ہو کر شعر وسخن میں مصروف رہنے کا راستہ سمجھا دیا۔اس کے بعد کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں جن کی تصنیف وتالیف کا شاہی سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ان میں سید بلاقی، شاہ راجو، میران جی خدا نما، فاروقی اور میران یعقوب کے کارنامے مشہور ہیں جو عبداللہ قطب شاہ کا تحفہ ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء ص:۶۸)

15.3.2 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ

ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ۱۰۶۶ھ میں منظرِ عام پر آئی۔اس سے پہلے بھی کئی اہم عشقیہ مثنویاں تحریر کی جا چکی تھیں۔مثلاً مثنوی 'قطب مشتری'، 'سیف الملوک وبدیع الجمال'، 'مینا ستونتی' اور 'طوطا مینا' وغیرہ۔ان مثنویوں میں روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ زورِ بیان کی خوبیاں قابلِ توجہ تھیں۔ابن نشاطی نے بھی 'پھول بن' میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔داخلی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ابتدا میں ابن نشاطی کی طبیعت شاعری کی طرف مائل نہیں تھی لیکن جب انھوں نے اپنے عہد کے شعرا کی قدر دانی دیکھی تو وہ بھی شاعری کی طرف مائل ہوئے اور مثنوی نگاری میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے 'پھول بن' جیسی مثنوی اُردو شعر وادب کو دی۔مثنوی 'پھول بن' فارسی تصنیف 'بساتین الانس' کے قصے پر مبنی ہے۔ابن نشاطی نے اصل

قصے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے کئی ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آ جاتا ہے۔ اگر تمام ابواب کے عنوان کے اشعار کو یکجا کر دیں تو پوری مثنوی کا لب ولباب سامنے آ جاتا ہے۔ مثنوی' پھول بن' میں متعدد قصے بیان ہوئے ہیں۔ کچھ قصے طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ مثنوی میں بعض قصے اصلی ہیں اور بعض فروعی نوعیت کے ہیں۔ اس پہلو پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے محمد اکبرالدین صدیقی نے لکھا ہے:

> ''' پھول بن' میں تین بسیط قصوں کے علاوہ تین تعارفی قصے بھی ہیں جو ان قصوں کے لیے چوکھٹے کا کام دیتے ہیں۔ یہ تمام قصے زاہد کی شخصیت سے منسوب کر دیے گئے ہیں لیکن زاہد اور کنچن پٹن کا بادشاہ' پھول بن' کے اہم اشخاص نہیں ہیں بلکہ اس کے اہم اشخاص (یہ) ہیں؛
>
> ا۔ ختن کے سوداگر کا بیٹا اور گجرات کے عابد کی بیٹی
>
> ۲۔ جوگیوں کا معتقد بادشاہ اس کا دغاباز وزیر اور رانی ستونتی
>
> ۳۔ سمن بر، ہمایوں فال، ملک سندھ کا ناعاقبت اندیش بادشاہ اور اس کا مکار وزیر۔''
>
> (محمد اکبرالدین صدیقی (مرتبہ)،' پھول بن'، ابن نشاطی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۷۰)

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مثنوی کے تین قصے اصل ہیں، باقی قصے فروعی ہیں۔ اس مثنوی میں ختن کے سوداگر کے قصے کو اصل قصہ بتایا گیا ہے۔ اس کہانی کا راوی سوداگر کا بیٹا ہے۔

مثنوی' پھول بن' کے قصے کا خلاصہ: ختن کے سوداگر کے پاس مال ودولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ کاروبار ایسا پھیلا ہوا تھا کہ مال برداری کے لیے دریا میں لاتعداد کشتیاں تھیں۔ ایک مرتبہ تجارت کے سلسلے میں وہ گجرات گیا۔ اس سفر میں اس کے ہمراہ اس کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ یہ دونوں جہاں ٹھہرے تھے، وہیں پاس میں ایک زاہد پارسا سکونت پذیر تھا جس کی ایک حسین وجمیل بیٹی تھی۔ سوداگر کے بیٹے کے دل میں زاہد کی بیٹی کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ اس کی گلی کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کی تڑپ سے زاہد کی بیٹی بھی پگھلی اور وہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ کسی نے اس کی خبر زاہد کو دے دی۔ آبرو جاتی ہوئی دیکھ کر مارے شرم کے وہ ایک حجرے میں بند ہو گیا اور بددعا دی کہ ان دونوں کی صورت تبدیل ہو جائے۔ اس طرح سوداگر کا بیٹا بلبل اور زاہد کی بیٹی گل کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ بادشاہ نے جب یہ سنا تو اسے خیال ہوا کہ خزانے میں ایک انگوٹھی ہے جسے اگر سوداگر کے بیٹے اور زاہد کی بیٹی پر جو گل اور بلبل کی صورت میں تبدیل ہو گئے تھے، پھرایا جائے تو وہ دونوں دوبارہ اصلی انسانی صورت

میں آسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت خزانے سے انگوٹھی منگوا کر دونوں پر پھرائی گئی جس سے وہ دونوں پھر سے آدمی بن گئے۔ متن کے سوداگر کا قصہ یہاں مکمل ہوگیا۔

مثنوی 'پھول بن' کی دوسری اہم کہانی جوگیوں کے معتقد بادشاہ، اس کے دغاباز وزیر اور رانی ستونتی سے شروع ہوتی ہے۔ جوگیوں کے معتقد بادشاہ، اس کے دغاباز وزیر اور رانی ستونتی کے قصے میں نقلِ رُوح کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں بھی یہ موضوع برتا گیا ہے۔ 'پھول بن' کا بادشاہ جوگیوں کا بڑا معتقد تھا۔ مختلف ملکوں کے جوگی اس کے دربار میں آتے تھے جن کے ساتھ وہ احترام سے پیش آتا تھا۔ ایک دن ایک جوگی دربار میں آیا اور بادشاہ کے احترام اور جذبۂ عقیدت سے خوش ہوکر اس نے بادشاہ کو نقلِ رُوح کا منتر سکھایا۔ ایک دن بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ شکار کے لیے گیا۔ پھرتے پھراتے دونوں ایک جنگل میں پہنچ گئے جہاں انھیں ایک مُردہ ہرن پڑا ہوا ملا۔ بادشاہ کے دل میں اس منتر کو آزمانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی رُوح ہرن کے جسم میں ڈال دی اور پھرنے لگا۔ دغاباز وزیر نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اپنی رُوح کو بادشاہ کے جسد میں منتقل کر کے وہ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ بادشاہ کی رانی 'ستونتی' نیک خاتون تھی۔ اسے بادشاہ کے بدلے ہوئے انداز سے شک ہوگیا۔ لہٰذا بادشاہ (دغاباز وزیر) جب اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ بہانہ کر کے ٹال جاتی۔ بادشاہ (جو ہرن کے جسم میں چلا گیا تھا) جب واپس آیا تو اسے اپنے جسد کو خالی دیکھ کر بڑا پچھتاوا ہوا اور سمجھ گیا کہ وزیر نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پاس ہی ایک مُردہ طوطا پڑا ہوا ہے۔ اس نے فوراً اس میں اپنی رُوح منتقل کی اور وہ بادشاہ کے شکاری کے گھر پر جا بیٹھا تاکہ شکاری اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے یہاں بیچ دے۔ شکاری اسے فریبی بادشاہ یعنی دغاباز وزیر کے پاس لے گیا۔ طوطے کی میٹھی باتیں سن کر فریبی بادشاہ بہت خوش ہوا اور اسے خرید کر وہیں رکھا جہاں ستونتی رہتی تھی۔ ایک دن طوطے نے ستونتی سے پوچھا کہ تو کیوں بے چین ہے۔ اس نے وجہ بتائی۔ طوطے نے اس کی وفاداری دیکھی تو رو کر اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ اب اگر وہ تجھ سے اظہارِ محبت کرے تو اس سے کہنا کہ مجھے شبہ ہے کہ تو وہ راجا نہیں ہے۔ چوں کہ طوطا نقلِ رُوح کا فن جانتا تھا۔ اس لیے طوطے نے ستونتی سے کہا کہ اگر تجھے پانے کے لیے اس پر وہ تیار ہوجائے تو مردہ قمری اس کے سامنے رکھ دینا۔ آگے کا کام میں سنبھال لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فریبی بادشاہ نے ستونتی پر قابو پانے کے لیے اپنی رُوح قمری میں منتقل کی۔ ادھر طوطا (جو اصل بادشاہ تھا) اپنے خالی جسد میں داخل ہوجاتا ہے اور قمری کو ہلاک کر کے واپس اپنی سلطنت سنبھال لیتا ہے۔ اس قصے کے بعد سمن بر اور ہمایوں فال کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں ملک عجم کا ایک بادشاہ تھا جس کی بیٹی سمن بر انتہائی حسین تھی۔ مصر کا شاہ زادہ ہمایوں فال بھی اس کے حسن کی شہرت سن کر اس کا دیوانہ ہوگیا اور اسے دیکھنے کے لیے سمن بر کے شہر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ صرف وہی اس کا دیوانہ نہیں بلکہ اس کے حسن کا ایک عالم دیوانہ ہے۔ کئی دنوں تک وہ اس

کے دیدار کے لیے ترستا ہوا اس کے محل کے اردگرد منڈلاتا رہا۔ پھر ایک دن قسمت اس پر مہربان ہوئی اور دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ شروع میں سمن بر کو اس کی محبت کا یقین نہیں آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ ہمایوں فال میں عاشقِ صادق کی ساری نشانیاں دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے پر دل و جان سے فدا ہوجاتے ہیں۔ دونوں کے ملنے کی خبریں پھیلتی ہیں۔ اس لیے دونوں گھر چھوڑ کر گھومتے گھومتے شہر سندھ میں جا کر 'بیت العاشقین' نام کے گھر میں مقیم ہوجاتے ہیں۔ یہاں انھیں کسی کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہمایوں فال سمن بر سے کہتا ہے کہ یہ بات وہ کسی کو بھی نہ بتائے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جہاں ہمایوں فال اور سمن بر رہتے تھے، وہاں ایک مالنی بھی رہتی تھی۔ وہ بادشاہ کے دربار میں پھول کے ہار بنا کر لے جایا کرتی تھی۔ سمن بر کے پاس بھی وہ پھول کے ہار، طرے اور چوٹی وغیرہ گوندھ کر لایا کرتی تھی۔ اسے سمن بر سے لگاؤ ہوگیا تھا۔ ایک دن اس نے سمن بر سے اس کے حالات پوچھے۔ سمن بر نے ہمایوں فال کی تاکید کے باوجود اپنا سارا حال اسے بتا دیا۔ ایک دن مالنی سمن بر کے ہاتھوں کا گندھا ہوا ہار لے کر بادشاہ کے دربار میں گئی۔ بادشاہ جو ہر روز مالنی کے گندھے ہوئے پھولوں کے ہار دیکھتا تھا، آج اسے پھولوں کے ان ہاروں میں ایک انوکھا پن نظر آیا۔ اس نے مالنی سے اصل بات معلوم کرنا چاہی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگی لیکن جان کی دھمکی کے بعد اس نے سمن بر کے حسن کی خوب تعریف کی۔ اس کے حسن کی تعریف سن کر بادشاہ اس پر عاشق ہوگیا اور اس کے دیدار کا طالب ہوا۔ بادشاہ کشتی میں سوار ہوکر سمن بر کے محل کے نیچے پہنچ گیا جہاں سے اس نے سمن بر کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ اس وقت وہ بال سکھانے کے لیے بیٹھی تھی اور ایسی نظر آتی تھی جیسی حوض کوثر پر حور۔ بادشاہ جب محل میں واپس گیا تو سارے درباریوں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے اپنی دیوانگی کی ساری کیفیت بیان کردی۔ ایک وزیر باتدبیر نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ندی کے کنارے ضیافت کی محفل آراستہ کرے اور شہزادہ ہمایوں فال کو دعوت پر بلائے۔ اسے خوب شراب پلائے۔ پھر اس سے شرط رکھے کہ وہ برہنہ ہوکر دریا سے کنول کا پھول توڑ لائے۔ اس کو آسان جان کر وہ کوئی عذر نہیں کرے گا۔ وہ دریا میں جائے گا اور مگرمچھوں کا لقمہ بن جائے گا۔ دوسری طرف سمن بر کو یہ گمان بھی نہیں ہوگا کہ آپ نے اسے دھوکہ دے کر قتل کیا ہے۔ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق انجام پایا۔ شہزادہ ہمایوں فال دریا میں برہنہ چلا گیا اور کودتے ہی ایک مچھلی اسے نگل گئی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو سمن بر کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے بادشاہ کے دل کی بات بتائے۔ وزیر نے سمن بر کو خوب سمجھایا لیکن بات نہیں بنی۔ یہ سن کر بادشاہ مایوس ہوگیا اور ساری سلطنت وزیر کے سپرد کرکے اس کے در پر جا ٹکا تاکہ اسے کچھ ترس آئے لیکن یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ دوسری طرف مصر کا بادشاہ اپنے بیٹے ہمایوں فال کی جدائی کے غم میں نڈھال تھا۔ کسی نے آکر شہزادے کے دھوکے سے مارے جانے کی بات بتائی۔ یہ سن کر وہ بے چین ہو اٹھا۔ اس نے سندھ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ جب سندھ کے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو اس نے قاصد کو بھیج کر اس کے آنے کا سبب

دریافت کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہم ڈرنے والے نہیں۔ مصری اور سندھی فوجوں میں معرکہ ہوتا ہے اور بالآخر مصری فوج کام یاب ہوجاتی ہے۔ مصری بادشاہ اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ لینے کی بات کرتا ہے۔ بادشاہ کے خزانے میں ایک مچھلی ہوتی ہے جس پر طلسم لکھا ہوا ہے۔ وہ مچھلی جب پانی میں ڈالی جاتی ہے تو وہ سمندر کی تہہ سے حقیقت ڈھونڈ نکالتی ہے۔ چنانچہ وہ مچھلی لائی گئی اور اسے پانی میں ڈالا گیا۔ پھر وہ مچھلی یہ خبر لائی کہ ایک مچھلی نے اسے نگل لیا تھا لیکن وہ اسے ہضم نہ کرسکی اور سمن بر کے جزیرے پر چھوڑ آئی ہے۔ اب وہ زندہ ہے اور پریوں کی قید میں ہے۔ اس خبر سے بادشاہ کو ذرا راحت محسوس ہوئی کہ اس کا فرزند ابھی زندہ ہے۔ پھر وہ اپنے ملک مصر کو روانہ ہوگیا۔ ہمایوں فال کی جدائی میں ادھر سمن بر کا برا حال تھا۔ اسے جب شہزادے کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ہمایوں فال کو تلاش کرنے کے لیے جوگن کا رُوپ دھار لیا۔ جسم پر خاک ملی اور گلے میں کنٹھا ڈال کر روانہ ہوگئی۔ سمن بر متعدد مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک جزیرے پر پہنچی۔ وہاں اسے ایک محل دکھائی دیا۔ سمن بر کو پتا چلا کہ یہ پریوں کا مقام ہے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد جس کے زیرِ نگیں دیو اور پریاں تھیں، بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اب سلطنت کی ذمے داری اس کی بیٹی 'ملک آرا' کے کاندھے پر آ گئی۔ ایک دن جب ملک آرا سیر کو گئی تو ایک محل پر اس کی نگاہ پڑی جس میں سمن بر رہتی تھی۔ اپنے دیدبانوں سے اس محل کی خوبی سننے کے بعد پری کو اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ملک آرا جب سمن بر سے ملی تو اس سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے ملک آرا کو سارا قصہ بتا دیا۔ ملک آرا نے پریوں کے بادشاہ کو ایک خط بھجوایا۔ پریوں کے بادشاہ نے خط کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد اپنے خادموں سے شہزادے کا پتا لگانے کے لیے کہا۔ بالآخر شہزادہ مل گیا اور اسے پریوں کے ساتھ ملک آرا کے نگر کو روانہ کر دیا گیا۔ دونوں بادشاہ یہ خبر سن کر بہت مسرور ہوئے، بڑی دعائیں دیں اور اظہارِ ممنونیت کے ساتھ خط کا جواب تحریر کیا۔ ملک آرا نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ دونوں کو ان کے ملک روانہ کر دیا۔ جب سمن بر اور ہمایوں فال اپنے شہر پہنچے تو انھیں دیکھنے کے لیے پوری خلقت اُمڈ پڑی اور سب کی خوشی دوگنی ہوگئی۔ پھر شہزادہ بے فکری سے اپنی سلطنت پر راج کرنے لگا۔ 'پھول بن' کا قصہ یہاں پر ختم ہوجاتا ہے۔

ابن نشاطی نے اپنی اس مثنوی میں 'قصہ در قصہ' کی تکنیک اختیار کی ہے اور کہانی بیان کرنے میں 'الف لیلہ' کا طریقہ اپنایا ہے۔ قصہ در قصہ کی تکنیک میں دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی قصے کو نامکمل چھوڑ کر درمیان سے ہی ایک نیا قصہ شروع کر دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک قصہ ختم کرنے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کیا جائے۔ ابن نشاطی نے 'پھول بن' میں یہی دوسرا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ قصہ مکمل ہونے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کرتے ہیں۔ فطری طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر اتنے فروعی قصوں کے بیان کا محرک کیا ہے؟ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا محرک سامع کو نئے قصے کے لیے تیار کرنا تھا۔

ابن نشاطی نے انتہائی چابک دستی سے اپنے تین تعارفی قصوں کی مدد سے تین اہم کہانیاں بیان کی ہیں۔ ان کہانیوں میں عشق، نقل رُوح، جوگیوں سے عقیدت، وفا شعاری، پند و نصیحت، فریب اور حرص و ہوس کے مختلف موضوعات بیان ہوئے ہیں۔

15.3.3 شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی ’پھول بن‘ کے فنی محاسن

ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ’پھول بن‘ میں شاعری کے دو اصول بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ صنائع و بدائع، صحت قافیہ اور خوب صورت تشبیہات شاعری کی جان ہیں۔ دوسرا یہ کہ شاعری میں کوئی نصیحت کی بات ہونی چاہیے۔ نصیحت اور صنعت دونوں کی یکجائی سے بلند شاعری وجود میں آتی ہے۔ ’پھول بن‘ میں یہ دونوں ہی اصول موجود ہیں۔ اس مثنوی کی ایک نمایاں خوبی اس کے اسلوب کی سادگی ہے جو مثنوی میں ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ملک سندھ کا بادشاہ اپنے مکار وزیر کو سمن بر کو پھسلانے کی ترکیبیں بتاتا ہے۔ واقعات کا یہ بیان سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہے۔ ’پھول بن‘ کی دوسری خوبی اس کا زورِ بیان ہے۔ دراصل ابن نشاطی کو موزوں تشبیہات کی مدد سے کسی بھی خیال اور فکر کو مزید وضاحت سے پیش کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے متنوع تشبیہات کی مدد سے مختلف مناظر اور واقعات کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر بادشاہ کا دربار میں بیٹھنا ایک عام بات ہے۔ ابن نشاطی نے بادشاہ کی اہمیت اور شان کو ’رضوان‘ کے حوالے سے اس طور پر اُبھارا ہے کہ پورا منظر ہماری نگاہوں میں متحرک ہو جاتا ہے۔ سادگی اور زورِ بیان کے علاوہ جذبات نگاری اور جزئیات نگاری ’پھول بن‘ کی اہم خوبیاں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کو جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے بیان میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ کسی چیز کا نقشہ یا کسی کیفیت کا بیان سرسری طور پر نہیں کرتے بلکہ اس معاملے میں وہ پوری ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی اس مثنوی میں جگہ جگہ جزئیات نگاری کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ’پھول بن‘ میں جہاں خط لکھنے کا بیان آیا ہے، وہاں صرف یہ نہیں کہا جاتا کہ خط کا مضمون اس طرح تھا بلکہ ایسی تفصیلات فراہم کی جاتی ہیں جن سے خط کی تیاری سے متعلق اہتمام کی پوری تصویر نگاہوں میں آجاتی ہے۔ مثلاً منشی کو بلایا جانا، اس کے بیٹھنے کا انداز، قلم کی خوبی، کاغذ کا رنگ، روشنائی کی خصوصیت اور القاب و خطابات کے آداب وغیرہ۔ ان تفصیلات سے یہ خط صرف خط نہیں رہتا بلکہ چیزے دیگر بن جاتا ہے۔ جزئیات نگاری کی ایک مثال یہاں پیش کی جا رہی ہے جس سے جزئیات نگاری میں ابن نشاطی کے کمال کا کچھ اندازہ ہوگا۔ یہ مثنوی میں وہ مقام ہے جب ہمایوں فال مچھلی کا لقمہ بن جاتا ہے اور سندھ کا بادشاہ سمن بر کو پھسلانے کے لیے اپنے وزیر باتدبیر کو روانہ کرتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

سمن بر تین دن تے دکھ میں پڑ کر　　رہی تھی پیو کے بچھڑے سوں اڑ کر
نہ سُک تھا دیس کوں نانِس کو آرام　　تپے ہور روئے بن دوجا نہ تھا کام
لکیا سو پیو کے بچھڑے سوں پردیس　　کری بھڑکیاں سوں دل کی، رات کوں دیس
نہ رک سک سوز دل کا عشق کے ساتھ　　دھویں سوں آہ کے دن کوں کری رات
انجو ہور سوز سوں ہر روز و ہر شب　　اگن پانی میں تن من غرق تھا سب

ابن نشاطی نے متعدد اشعار میں سمن بر کی جذباتی کیفیت کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔انھوں نے کہیں کہیں شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لیے بھی جزئیات نگاری کو برتا ہے۔کھانوں اور ہتھیاروں کے ذکر کے ساتھ اس قبیل کی اور چیزیں جہاں انھوں نے بیان کی ہیں، وہاں انھوں نے شاعرانہ کمالات کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ابن نشاطی بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھے۔اس وجہ سے دوسرے شعرا کے برخلاف ان کے یہاں عربی و فارسی الفاظ صحتِ املا و تلفظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ضرورتِ شعری کی وجہ سے صحتِ الفاظ اور املا سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے قافیے کی صحت کا بھی خیال رکھا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس مثنوی کی یہ انفرادیت ہے کہ اس میں شاعر نے نظم میں انشا کی خوبیاں پیدا کی ہیں''۔ابن نشاطی نے مختلف اشیا کے بیان میں توازن قائم رکھا ہے۔انھوں نے طلوع و غروب آفتاب، چاندنی رات، میدان جنگ، لشکروں کی تیاری اور رزم و بزم کے نقشے پیش کرنے میں انتہائی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔باغات اور محلات کے مناظر پیش کرتے ہوئے انھوں نے ہمارے سامنے قطب شاہی عہد کے تعمیراتی نمونوں کو کمال ہوشیاری سے پیش کیا ہے۔کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی یہ مثنوی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ابن نشاطی نے عام انسانی کردار کے ساتھ ساتھ فوق فطری کردار بھی پیش کیے ہیں۔نسوانی کرداروں بالخصوص مینا ستونتی اور سمن بر کے کردار کو پیش کرنے میں ابن نشاطی نے اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے۔یہ دونوں نسوانی کردار اپنی استقامت اور وفا شعاری کی وجہ سے سامعین کے حافظے میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ابن نشاطی کی کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ ان کے خلق کیے ہوئے سارے کردار اپنے منفرد خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ابن نشاطی نے 'پھول بن' میں اپنی انشا پردازی کے اظہار کے لیے صنائع و بدائع کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ان صنعتوں میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی صنعتیں شامل ہیں۔چند مثالیں دیکھیے :

تجنیس تام مماثل:

مج آئینہ کوں دے دل کے جلا توں　　　سدا صحت کی راحت سوں جلا توں

تلمیح:

کتے تھے اس کے لب پر کوئی نجھا کر　　　یو وو ہے جس گیا ڈھنڈنے سکندر

مجاز مرسل:

کنگوی آرے تلے گر سر نہ دیتی　　　کہاں زلفاں کوں انگلیاں سو لیتی

مراعاۃ النظیر:

پڑے دیک بلبلاں آنے کے ہولاں　　　بندے شبنم کے موتی گل کے پھولاں

حسن تعلیل:

تو دیکھیا ہے جدھیاں تے کر اُپر موں　　　لرزتا ہے گگن پر سورا جنوں

مبالغہ:

وہاں چشمے جو نکلے تے زمیں تے　　　مٹھائی میں مٹھے تھے انگبیں تے

مذکورہ ادبی خوبیوں یعنی سادگی وسلاست، روانی، زورِ بیان، صحتِ الفاظ واملا اور صنائع وبدائع وغیرہ کے حسین استعمال کی بنیاد پر مثنوی 'پھول بن' اُردو کی ایک اہم کلاسیکی مثنوی کے طور پر ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔

15.3.4 ماحصل

ابن نشاطی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مثنوی 'پھول بن' سے پتا چلتا ہے کہ وہ ابن نشاطی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاطی تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاطی تخلص اختیار کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ابن نشاطی کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کی تعلیم وتربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ فارسی ادب اور شاعری

کے علاوہ فنِ بلاغت اور خاص طور پر علمِ معانی و بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ ابن نشاطی انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے۔ ابن نشاطی نے مثنوی کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ زمانے کے چلن کے مطابق انھوں نے غزلیں بھی نہیں کہیں سوائے ایک غزل کے جو 'پھول بن' میں شامل ہے۔ ابن نشاطی کی سب سے مشہور مثنوی 'پھول بن' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور مثنوی 'طوطی نامہ' بھی ہے جو ہندوستان کا ایک مقبول قصہ ہے۔ گارساں دتاسی نے اس کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ بیان کیا ہے لیکن شمس اللہ قادری نے 'اُردوئے قدیم' میں اسٹوارٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۶۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ بخشی کی فارسی کتاب کا ترجمہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اس کا چربہ ہے۔ ابن نشاطی نے اپنی مشہور مثنوی 'پھول بن' ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی جو ۱۷۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ 'پھول بن' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ایک فارسی قصہ 'بساتین الانس' کا چربہ ہے جس کو ابن نشاطی نے سادگی اور زورِ بیان کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ 'پھول بن' قصہ در قصہ کی تکنیک میں لکھی گئی مثنوی ہے جس میں تین تعارفی اور تین تفصیلی قصے ہیں۔ ابن نشاطی نے اپنی اس مثنوی میں جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے ایسے دل کش مرقعے پیش کیے ہیں کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ شاعر ابن نشاطی نے اس میں انتالیس قسم کے صنائع و بدائع کے حسین استعمال سے اس کو ایک ادبی شاہ کار بنا دیا ہے۔ ابن نشاطی کی اس مثنوی کی نظم میں انشا کی تمام خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ انھوں نے نادر تشبیہات کی مدد سے منظر کو دل کش، متحرک اور جان دار بنا دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے تسلسل میں کہیں بھی انقطاع نہیں ہے۔ تمام ماہرین نے اس کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُردو مثنوی کی تاریخ 'پھول بن' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے ادبی کارناموں سے آگہی حاصل کی۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' سے بحث کی۔
- شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے فنی محاسن سے آگہی حاصل کی۔
- اُردو مثنوی نگاری میں شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی کے مقام و مرتبے کو سمجھا۔

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ابن نشاطی کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' کب اور کتنے دنوں میں مکمل کی اور یہ مثنوی کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟

۳۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے موضوع سے بحث کیجیے۔

۴۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کی تکنیک پر روشنی ڈالیے۔

۵۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کی خصوصیات وامتیازات بیان کیجیے۔

15.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ ابن نشاطی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے حالات زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔مثنوی 'پھول بن' سے پتا چلتا ہے کہ وہ ابن نشاطی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاطی تخلص کرتے تھے۔اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاطی تخلص اختیار کیا۔پروفیسر عبدالقادر سروری نے ابن نشاطی کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔مثنوی 'پھول بن' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ فنِ بلاغت اور خاص طور پر علمِ معانی و بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ابن نشاطی انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے۔نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' لکھنے سے پہلے شعر گوئی کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ وہ غزل گو شاعر تھا۔وہ مثنوی ہی سے اپنی شہرت کا طالب ہے۔مثنوی 'پھول بن' سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے، وہ معاصرین کے بجائے پیش رووں سے اپنے کلام کی داد چاہتے ہیں۔وہ اپنے پیش رووں میں فیروز، محمود، خیالی اور حسن شوقی کے کمالات کے معترف تھے۔دراصل ابن نشاطی نے ان ہی اساتذہ کرام کے اسلوب کی پیروی کی تھی۔ان کو اندازہ تھا کہ ان کا تخلیقی اسلوب اگر کسی کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے تو وہ ان کے پیش روشعرا کا اسلوب ہے۔اسی لیے انھوں نے ان کے نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

۲۔ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی۔ یہ مثنوی ۱۷۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۔ مثنوی 'پھول بن' ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں شہزادی پھول بن کا قصہ ہے۔ اس مثنوی کی کہانیوں میں عشق، نقلِ رُوح، جوگیوں سے عقیدت، وفا شعاری، پند و نصیحت، فریب اور حرص و ہوس وغیرہ مختلف موضوعات بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' میں قصہ در قصہ کی تکنیک اختیار کی ہے اور کہانی بیان کرنے میں الف لیلہ کا طریقہ اپنایا ہے۔ قصہ در قصہ کی تکنیک میں دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی قصے کو نامکمل چھوڑ کر درمیان سے ہی ایک نیا قصہ شروع کر دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک قصہ ختم کرنے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کیا جائے۔ ابن نشاطی نے 'پھول بن' میں یہی دوسرا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ قصہ مکمل ہونے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کرتے ہیں۔ فطری طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر اتنے فروعی قصوں کے بیان کا محرک کیا ہے؟ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا محرک سامع کو نئے قصے کے لیے تیار کرنا تھا۔ ابن نشاطی نے انتہائی چابک دستی سے اپنے تین تعارفی قصوں کی مدد سے تین اہم کہانیاں بیان کی ہیں۔

۵۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے ادبی شاہ کار ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابن نشاطی نے اپنی اس مثنوی میں جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے ایسے دل کش مرقعے پیش کیے ہیں کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ شاعر ابن نشاطی نے اس میں انتالیس قسم کے صنائع و بدائع کے حسین استعمال سے اس کو ایک ادبی شاہ کار بنا دیا ہے۔ ابن نشاطی کی اس مثنوی کی نظم میں انشا کی تمام خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ سادگی و سلاست، روانی، زورِ بیان، صحتِ الفاظ و املا اور صنائع و بدائع وغیرہ کے حسین استعمال کی بنیاد پر مثنوی 'پھول بن' اُردو کی ایک اہم کلاسیکی مثنوی کے طور پر ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔ یہ مثنوی فنی لطافت اور دل کشی میں دکن کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

15.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
ادب پرور	:	ادب کی سرپرستی کرنے والا

مشاطگی	:	سجانے اور سنوارنے کا کام
محاسن	:	حسن کی جمع، خوبیاں
پردۂ خفا	:	پوشیدگی کے پردے میں، مراد مخفی ہونا، پوشیدہ ہونا
گونا گوں	:	مختلف قسم کا، طرح طرح کا
پیش رو	:	آگے آگے چلنے والا، مراد شاعر کے زمانے سے پہلے کے شعرا
سخن گستری	:	شاعرانہ انداز، خوش بیانی
صنائع و بدائع	:	وہ عجیب و غریب نکات اور باریکیاں جو نظم یا کلام میں اس کی خوبی اور اپنی طبیعت کی رسائی ظاہر کرنے کے واسطے عمداً لائی جائیں
معتقد	:	اعتقاد رکھنے والا
ناعاقبت اندیش	:	انجام نہ سوچنے والا
بدبخت	:	بدنصیب
سرو	:	ایک مشہور درخت جو سیدھا مخروطی شکل کا ہوتا ہے
سینہ کوبی	:	سینہ پیٹنا
نقلِ رُوح	:	رُوح کی منتقلی
جسد	:	جسم
قمری	:	فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ
کوثر	:	جنت کی ایک نہر، جنت کا حوض
برہنہ	:	ننگا
مہر	:	پیار، محبت
طلسم	:	جادو، جادو کے خطوط اور نقوش
دیدبان	:	پہرے دار
ممنونیت	:	احسان مندی
تزک و احتشام	:	شان و شوکت

خلقت	:	لوگ، عوام
گنج	:	خزانہ
مار	:	سانپ

15.8 کتب برائے مطالعہ

١۔ دکن میں اُردو : نصیرالدین ہاشمی

٢۔ دکنی ادب کی تاریخ (مرتبہ) : ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

٣۔ تاریخ ادبِ اُردو (جلد اول، قدیم دور) : ڈاکٹر جمیل جالبی

٤۔ پھول بن (مرتبہ) : پروفیسر عبدالقادر سروری

٥۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 16 میر غلام حسنؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (سحرالبیان: داستان وارد ہونے بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں)

ساخت

16.1 اغراض ومقاصد
16.2 تمہید
16.3 میر غلام حسنؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
16.3.1 میر غلام حسنؔ کے سوانحی احوال وکوائف اور ادبی کارنامے
16.3.2 میر غلام حسنؔ کی مثنوی نگاری
16.3.3 متن کی تدریس و تفہیم
16.3.4 ماحصل
16.4 آپ نے کیا سیکھا؟
16.5 اپنا امتحان خود لیجیے
16.6 سوالوں کے جوابات
16.7 فرہنگ
16.8 کتب برائے مطالعہ

16.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- میر حسنؔ کے سوانحی احوال وکوائف اور ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے۔
- میر حسنؔ کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے۔
- میر حسنؔ کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

16.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار ملا وجہی، نصرتی اور ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات اور فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے بلند پایہ اور اہم مثنوی نگار میر حسن کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے اور ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔ ساتھ ہی ان کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

16.3 میر غلام حسن: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

16.3.1 میر غلام حسن کے سوانحی احوال و کوائف اور ادبی کارنامے

میر حسن کا اصلی نام 'میر غلام حسن' اور تخلص 'حسن' تھا۔ ان کے والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا جو اپنے وقت کے بڑے ہجو گو شاعر تھے۔ میر ضاحک کا شمار میر تقی میر اور سودا کے ہم عصر شعرا میں ہوتا ہے۔ سودا سے ان کی خوب نوک جھونک چلتی تھی۔ میر حسن نے اپنے دیوان کے دیباچے اور 'تذکرہ شعرائے اُردو' میں اپنے خاندانی حالات کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے جد اعلیٰ عہد شاہجہانی کے اواخر میں ہرات سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ دہلی ہی میں میر حسن کی پیدائش ہوئی لیکن کس سنہ میں ان کی ولادت ہوئی، اس سلسلے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ مصحفی نے 'تذکرۂ ہندی' میں لکھا ہے کہ میر حسن ۶۰ برس کے تھے کہ ۱۲۰۱ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۱۳۶ھ۔۱۱۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تحقیق کے مطابق میر حسن کی ولادت پرانی دلی کے محلّہ سید واڑہ میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ 'میر حسن کی ولادت میرے قیاس کے بہ موجب سنہ ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ ہے'۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بعض قرائن سے میر حسن کا سال پیدائش ۱۱۵۴ھ کے قریب قرار دیا ہے۔ ویسے عام طور پر جو ان کی تاریخ پیدائش بیان کی جاتی ہے، وہ ۱۷۲۷ء ہے۔ میر حسن نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد محترم سے حاصل کی اور ان ہی کی سرپرستی میں ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ حالاں کہ دلی کی سماجی اور سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے ان کی تعلیم میں رُکاوٹ آتی رہی، پھر بھی اپنے والد سے انھوں نے تھوڑی بہت عربی سیکھ لی اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا۔ میر حسن نے جب آنکھیں کھولیں تو ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ ایسے ماحول میں انھیں بھی شعر و شاعری سے شغف ہوا۔ چنانچہ میر حسن بچپن ہی سے فارسی میں شعر

کہنے لگے۔ ابتدا میں وہ اپنا کلام اپنے والد کو دکھایا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے خواجہ میر دردؔ کی شاگردی اختیار کی۔ جب دہلی میں ہنگامہ برپا ہوا، معاشی حالات ابتر ہوئے اور ہر طرف لوٹ مار مچی تو اکثر شرفا جان و مال کی حفاظت کے لیے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ سوداؔ، میر تقی میرؔ، جرأتؔ اور میر سوزؔ سب دہلی چھوڑ کر اودھ کا رُخ کر چکے تھے۔ ایسے حالات میں میر حسنؔ کے والد میر ضاحکؔ نے بھی اہل و عیال کے ساتھ دہلی کو خیر باد کہا۔ دہلی سے نکلنے کے بعد وہ پہلے لکھنؤ پھر فیض آباد اور اس کے بعد پھر لکھنؤ پہنچے۔ اپنے والد کے ہمراہ میر حسنؔ بھی تھے۔ میر حسنؔ کو دہلی چھوڑنے کا بہت ملال تھا جو درج ذیل اشعار سے عیاں ہے:

قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے ہوا آوارہ ہندستان جب سے

ہوئی اس سے جدائی سخت مشکل لگا تھا ایک بت سے واں مرا دل

میر حسنؔ دہلی سے فیض آباد پہنچے۔ اُردو شاعری کی جانب وہ فیض آباد ہی میں متوجہ ہوئے۔ وہاں انھوں نے پہلے میر ضیاء الدین ضیاؔ اور پھر میر سوداؔ سے کلام پر اصلاح لی۔ فیض آباد میں میر حسنؔ پہلے آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے سردار جنگ مرزا نوازش علی خان کے ملازم ہوئے۔ ۱۷۷۰ء میں جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو پایۂ تخت بنالیا تو سالار جنگ بھی اپنے متعلقین کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہوگئے جن کے ساتھ میر حسنؔ کو بھی فیض آباد جانا پڑا۔ فیض آباد جاتے ہوئے میر حسنؔ کا لکھنؤ میں قیام ہوا تھا۔ اس وقت لکھنؤ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو ان کو بالکل پسند نہیں آیا اور اس کی ہجو کہہ ڈالی۔ ذیل میں ان کے ہجو یہ اشعار دیکھیے:

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
ہر ایک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے ہوا کا بھی وہاں مشکل گزر ہے
سوائے تودہ خاک اور پانی یہاں دیکھی ہر اک شئے کی گرانی
زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

لکھنؤ کی یہ ہجو میر حسنؔ کو بہت مہنگی پڑی کیوں کہ لکھنؤ آصف الدولہ کے خوابوں کا مرکز تھا جسے وہ رشکِ شاہجہاں آباد بنانا چاہتے تھے۔ اس لکھنؤ کو کوفہ قرار دینا اور ساتھ ہی یہ کہنا کہ کسی شیعہ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس شہر کو اچھا کہے، آصف الدولہ کے دل میں چُبھ گیا۔ آصف الدولہ کی اسی ناراضگی کی وجہ سے لکھنؤ میں میر حسنؔ پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے نواب کو راضی کرنے کے لیے مثنوی 'سحرالبیان' لکھی جس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی تھا اور نواب سے حضرت علیؓ اور آلِ رسولؐ کا واسطہ دے کر معافی طلب کی گئی تھی۔ ۱۷۸۴ء میں جب یہ مثنوی مکمل

ہوئی تو نواب قاسم علی خاں بہادر نے کہا کہ مجھے یہ مثنوی دو کہ میں اسے تمہاری طرف سے نواب کے حضور میں لے جاؤں لیکن میر حسنؔ نے ان کا اعتبار نہ کیا اور ان کو بھی ناراض کر بیٹھے۔ پھر جب کسی تقریب کے موقع پر میر حسنؔ کی رسائی دربار تک ہوئی تو نواب قاسم نے انتقاماً ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

میر حسنؔ نے بیش تر اصناف سخن؛ مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رُباعی، قطعات اور مخمس وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں اُردو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں لیکن اُردو شاعری میں ان کو اصل شہرت ومقبولیت مثنوی نگاری سے ملی۔ وہ اُردو کے بلند پایہ مثنوی نگار ہیں۔ ان سے بارہ مثنویاں یادگار ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ 'نقل کلاونت'، 'نقل زن فاحشہ'، 'ہجو قصائی'، 'نقل قصائی'، 'مثنوی شادی آصف الدولہ'، 'رموز العارفین'، 'مثنوی ہجو حویلی'، 'گلزار ارم'، 'مثنوی درتہنیت عید'، 'مثنوی قصر جواہر'، 'مثنوی درخوان نعمت' اور 'مثنوی سحر البیان'۔ ان میں سے 'گلزارِ ارم'، 'سحر البیان' اور 'رموز العارفین' طویل مثنویاں ہیں جب کہ ان کی دیگر مثنویاں مختصر ہیں۔ ان کی مثنوی 'خوان نعمت' میں آصف الدولہ کے دسترخوان پر چنے جانے والے کھانوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جب کہ مثنوی 'رموز العارفین' میں جو اپنے وقت میں خاصی مقبول تھی، عارفانہ اور مصلحانہ مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ میر حسنؔ نے اگرچہ کئی مثنویاں لکھیں لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ان کی آخری مثنوی 'سحر البیان' کو ملی۔ ایسی مقبولیت ان کی کسی مثنوی کے حصے میں نہیں آئی۔ اس یادگار مثنوی کی وجہ سے اُردو مثنوی کی روایت میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے مستند ہوگیا۔ میر حسنؔ کا ایک اہم ادبی کارنامہ 'تذکرہ شعرائے اُردو' ہے۔ یہ تذکرہ انھوں نے فارسی زبان میں لکھا ہے جس میں انھوں نے تقریباً تین سو شعرا کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں۔ میر حسنؔ نے تقریباً ساٹھ ۶۰ برس کی عمر پائی۔ ان کی وفات ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات سے متعلق مصحفیؔ کا مصرعہ 'شاعر شیریں زبان تاریخ یافت' بہت مشہور ہے جس سے تاریخ وفات ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء نکلتی ہے۔ ان کی اس تاریخ وفات پر تقریباً سب کا اتفاق ہے۔

16.3.2 میر غلام حسنؔ کی مثنوی نگاری

میر غلام حسنؔ نے اگرچہ مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی بنیادی شناخت مثنوی نگار کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شمار اُردو کے ممتاز اور اہم مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے۔ میر حسنؔ بچپن سے شاعری کے شوقین تھے۔ کم سنی میں وہ اپنے والد کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ بعد میں خواجہ میر دردؔ کو اپنا کلام سنانے لگے۔ فیض آباد میں انھوں نے میر ضیاء الدین ضیاؔ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ خواجہ میر دردؔ کی دی ہوئی تعلیم اور ان کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ میر حسنؔ نے 'رموز العارفین' جیسی مثنوی لکھی جسے خاصی قبولیت حاصل ہوئی۔ 'رموز العارفین' اور 'گلزار ارم' کا شمار میر حسنؔ کی اچھی اور مقبول مثنویوں میں ہوتا ہے لیکن ان کی شاہ کار مثنوی 'سحر البیان' ہے۔ یہ

بے مثال مثنوی قصۂ بے نظیر و بدر منیر کے نام سے بھی معروف ہے۔ اُردو زبان میں جن دو مثنویوں کو سب سے زیادہ قبولیت اور شہرت ملی، ان میں میر حسن کی 'سحر البیان' اور دیا شنکر نسیم کی 'گلزارِ نسیم' کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ''ہمارے ملکِ سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک 'سحر البیان' دوسرے 'گلزارِ نسیم' اور تعجب یہ کہ دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں''۔ میر حسن نے یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ مطابق ۸۵-۱۷۸۴ء میں تحریر کی۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر میر حسن کے دوست میر شیر علی افسوس نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا جسے فورٹ ولیم کالج کی طرف سے پہلی بار ۱۸۰۵ء میں شائع کیا گیا۔ یہ مثنوی تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۳۸ اشعار حمد کے اور ۱۲۹ اشعار نعت کے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ۱۶ اور اصحاب پاک کی مدح میں ۴ اشعار ہیں۔ مناجات کے ۱۴ اشعار کے بعد ۱۰ اشعار سخن کی تعریف میں، ۴ اشعار شاہ عالم بادشاہ کی توصیف میں اور اس کے بعد ۱۸۵ اشعار آصف الدولہ کی مدح میں ہیں۔ میر حسن نے دعویٰ کیا ہے کہ مثنوی 'سحر البیان' کی کہانی ان کا اپنا اختراع ہے۔ میر حسن کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیوں کہ مثنوی کے قصے میں جتنی باتیں ہیں، وہ دوسرے مختلف قصوں، کہانیوں اور داستانوں میں موجود ہیں جنھیں جوڑ کر میر حسن نے ایک نئی داستان تیار کر دی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

> ''مثنوی کا پلاٹ گو بہ ظاہر طبع زاد ہے لیکن اس کے مختلف اجزا الف لیلہ، قدیم فارسی مثنویوں اور داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ بادشاہ کے اولاد نہ پیدا ہونا اور پھر اوائلِ شباب میں بیٹا پیدا ہونا ایسا عام خیال ہے جو کسی داستان کی جاگیر نہیں۔ درویش کا قصہ بھی بادشاہ کی لاولدی سے شروع ہوتا ہے۔ شہزادے کے بارے میں نجومیوں کی یہ پیش گوئی کہ اسے بارہ یا چودہ سال کی عمر تک کوئی اندیشہ نہیں پیش پا افتادہ تمہید ہے۔''
>
> (پروفیسر گیان چند جین، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۳۱۶)

میر حسن نے مثنوی 'سحر البیان' کے قصے کے اجزا مختلف کہانیوں اور داستانوں سے اخذ ضرور کیے ہیں مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انھیں اس خوبی سے پیوست کیا ہے کہ ایک جان ہو گئے ہیں اور ہر جگہ توازن کا خیال رکھا ہے۔

مثنوی کا پلاٹ: مثنوی 'سحر البیان' میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ایک بادشاہ تھا جس کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ نجومیوں نے یہ خوش خبری دی کہ جلد ہی سلطنت کا وارث آنے

والا ہے مگر بارہویں برس میں اسے خطرہ لاحق ہوگا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے یہاں ایک خوب صورت شہزادہ نے جنم لیا جس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ بادشاہ نے شہزادہ کو دنیا کی نظروں سے چھپا کے رکھا مگر حساب میں بھول چوک ہوگئی اور بارہ برس کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی شہزادے کو کھلی چھت پر سونے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ نجومیوں کی بات سچ نکلی۔ جب شہزادہ محل کی چھت پر چاندنی رات میں سویا ہوا تھا تو ایک پری ماہ رخ کی شہزادہ بے نظیر پر نظر پڑ گئی اور وہ اس پر عاشق ہوگئی۔ پھر کیا تھا وہ اسے اپنے تخت پر اُڑا کر پرستان لے گئی۔ وہاں وہ گھر والوں سے اسے چھپا کر اپنے پاس رکھتی ہے۔ خود دن بھر وہ وہاں نہیں رہتی ہے۔ اس لیے بے نظیر کی تنہائی دور کرنے کے لیے وہ اسے کل کا گھوڑا دیتی ہے۔ اتفاق سے ایک دن یہ گھوڑا ایک شام شہزادی بدر منیر کے باغ میں اُتر جاتا ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر وزیر زادی نجم النسا کی تدبیر کام آتی ہے۔ اسی کی تدبیر سے دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں مگر ایک دیو ماہ رخ پری کو اس کی خبر دیتا ہے۔ ماہ رخ پری بہت غصہ ہوتی ہے اور شہزادے کو ایک صحرا کے ایک اندھے کنویں میں قید کروا دیتی ہے۔ بے نظیر کے اچانک غائب ہو جانے سے بدر منیر بہت پریشان ہوتی ہے۔ یہ حال دیکھ کر نجم النسا جوگن کا بھیس بدل کر بے نظیر کی تلاش میں پرستان پہنچ جاتی ہے جہاں جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ اس پر دل و جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ نجم النسا اس شرط کے ساتھ اس کی طرف راغب ہوتی ہے کہ وہ بے نظیر کو تلاش کرے۔ فیروز شاہ اسے تلاش کر کے ماہ رخ پری کی قید سے رہائی دلاتا ہے۔ قید سے رہائی کے بعد بے نظیر اور بدر منیر زندگی بھر کے رشتے کی ڈور میں بندھ جاتے ہیں اور نجم النسا کی شادی فیروز شاہ سے ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ مثنوی کا قصہ اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

کردار نگاری:

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کی ایک اہم خوبی کردار نگاری ہے۔ انھوں نے اپنی اس مثنوی میں دو قسم کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ایک فطری یعنی حقیقی اور دوسرے فوق فطری کردار۔ فطری کرداروں میں بے نظیر، بدر منیر اور نجم النسا ہیں جو قصے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے مرکزی کردار چار ہیں؛ شہزادہ بے نظیر، شہزادی بدر منیر، وزیر زادی نجم النسا اور ماہ رخ۔ میر حسنؔ نے ان تمام کرداروں کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بے نظیر کے کردار میں جو اس کہانی کا ہیرو ہے، کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔ ابتدا سے آخر تک وہ ایک جیسا ہی رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ مثنوی کی ہیروئن بدر منیر کے کردار میں بھی کوئی بہت متاثر کن پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ جذبات سے مغلوب عورت ہے جو پہلی ہی ملاقات میں بے ہوش ہو جاتی ہے، پھر ہجر میں اس پر مسلسل غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور دوسری ملاقات کے بعد سے وہ ہر رات

وصل سے سیراب ہونے لگتی ہے۔ ماہ رخ پری خود پسند اور عاشق مزاج عورت ہے۔ خود غرضی، ظلم اور دوسروں کے احساسات پر اپنی خواہشات کی تکمیل کو مقدم سمجھنا اس کا شیوہ ہے۔ ان کرداروں کے مقابلے میں نجم النسا کا کردار سب سے زیادہ متحرک اور فعال ہے جو مثنوی کا جیتا جاگتا اور جان دار کردار ہے۔ میر حسنؔ نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

تھی نجم النسا ایک دخترِ وزیر نہایت حسین اور قیامت شریر

نجم النسا کے کردار میں زندگی پھوٹ پھوٹ کر اُبل رہی ہے۔ اس کی طبیعت میں وفاداری اور ایثار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ دنیا دار، ہوشیار اور عملی قسم کی عورت ہے جو ہر جگہ اپنی عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور دانش مندی، صبر و تحمل سے اپنا کام انجام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے 'سحرالبیان' کا بہترین اور شاہ کار کردار قرار دیا گیا ہے۔ مثنوی 'سحرالبیان' میں چند چھوٹے چھوٹے اور بھی کردار ہیں، مثلاً جنوں کا بادشاہ، کنیزیں، ملکہ، بادشاہ اور جنوں کا شہزادہ وغیرہ لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کردار نگاری میں میر حسنؔ کا کمال نجم النسا کی پیش کش میں نظر آتا ہے اور ان کے کچھ دوسرے کردار بھی دل چسپ ہیں۔

مکالمہ نگاری:

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کا ایک اہم فنی وصف بہترین مکالمہ نگاری ہے۔ اس مثنوی میں ان کے ذریعے اس خوبی سے مکالمے برتے گئے ہیں کہ وہ قصے میں پیوست ہو گئے ہیں اور کہانی کا جزو معلوم ہوتے ہیں جس سے پلاٹ کا فطری ارتقا ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی کی دل چسپی میں اضافہ ہوا ہے اور افرادِ قصہ کی جیتی جاگتی تصویر قارئین کی نگاہوں کے سامنے آ گئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار دیکھیے جس میں بدر منیر شہزادہ بے نظیر سے کہتی ہے:

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے

میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

جذبات نگاری:

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' میں عمدہ جذبات نگاری بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بے نظیر کے باپ کی بیٹے سے جدائی، کنیزوں کا اس کے فراق میں بے تاب و بے قرار ہونا، شہزادہ سے پری کی خفگی، بدر منیر کا بے نظیر کے فراق

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میں افسردہ و غم گین ہونا، ان تمام موقعوں پر میرحسؔن نے کرداروں کے جذبات کی دل چسپ مصوری کی ہے جس سے مثنوی کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرحسؔن نے 'سحرالبیان' میں جذبات نگاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں، ان میں رقت انگیز انسانی جذبات کی سب سے پہلی تصویر اس وقت ہمارے سامنے آتی ہے جب شہزادہ بے نظیر کو ماہ رخ پری اٹھا کر لے جاتی ہے جس سے شاہی محل ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ بے نظیر کے گم ہو جانے پر اس کے والدین اور کنیزوں کی مختلف کیفیات اور رقت انگیز انسانی جذبات کی تصویر درج ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو:

کوئی سر پر رکھ ہاتھ، دل گیر ہو　　گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی　　رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

شہزادہ کے فراق میں بدرمنیر کی حالت دیکھیے:

دوانی سی ہر سو وہ پھرنے لگی　　درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

خفا زندگانی سے ہونے لگی　　بہانے سے جا جا کے سونے لگی

میرحسؔن نے 'سحرالبیان' میں انسانی جذبات مثلاً خوشی، غم، غصہ، نا امیدی، محبت اور نفرت وغیرہ کی نادر اور دل کش تصویریں پیش کی ہیں اور مناظرِ فطرت کے پس منظر میں انسانی جذبات کو پیش کر کے ایک وجد آفریں کیفیت پیدا کر دی ہے۔ میرحسؔن نے جذبات کی عکاسی میں ہر جگہ حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے شرم و حیا کے جذبات کی مرقع کشی میں بھی اپنے محاکاتی حسن بیان کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے کہیں تخیل کو بلند ہونے دیا ہے اور نہ روزمرہ و محاورہ کے بجائے تشبیہ و استعارہ کی جولانیاں دکھائی ہیں۔

معاشرت کی عکاسی:

میرحسؔن کی مثنوی 'سحرالبیان' کی ایک اہم خوبی معاشرت کی عکاسی ہے۔ اس مثنوی میں اس زمانے کی حالت، معاشرہ کے رنگ ڈھنگ، رہن سہن کے طور طریقوں، لباس، رسم و رواج، زندگی کے مشاغل، تہذیب و تمدن، زیورات، شادی بیاہ کی رسوم، درباروں کی دھوم دھام، محلات، شہزادوں کی ولادت پر خوشی اور جشن، نذر و نیاز اور تحائف وغیرہ کی ایسی دل چسپ تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ مثنوی شاہانِ اودھ کی درباری زندگی کا حسین مرقع معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار دیکھیے:

بنا ٹھاٹھ نقار خانے کا سب　　مہیا کر اسبابِ عیش و طرب

دیا چوب کو پہلے تم سے ملا لگی پھیلنے ہر طرف کو صدا
بجے شادیانے جو واں اس گھڑی ہوئی گرد و پیش آ کے خلقت کھڑی

میر حسن نے اپنی اس مثنوی میں اپنے زمانے کے لوگوں کی جنسی کیفیات اور سوچنے کے انداز کو بھی پیش کیا ہے۔ بادشاہ کے بارے میں مندرجہ ذیل شعر اس ماحول میں رہنے والے تمام انسانوں کے ذوق اور رجحان کا آئینہ دار ہے:

سدا ماہ رویوں سے صحبت اسے سدا جامہ زیبوں سے رغبت اسے

منظر نگاری:

میر حسن کی مثنوی 'سحرالبیان' کا ایک اہم فنی وصف منظر نگاری ہے۔ منظر نگاری میں میر حسن نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے اور جس منظر کو پیش کیا ہے، وہ قاری کے ذہن و دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے مثنوی 'سحرالبیان' کی منظر نگاری کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کر دیے ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت، تخت گاہ کی رونق اور چہل پہل، لاولدی کی حالت میں یاس و ناامیدی اور دنیا سے دل برداشتگی، جوتشیوں کی گفتگو، شہزادہ کی ولادت اور چھٹی کی تقریب، ناچ رنگ اور گانے بجانے کے ٹھاٹھ، باغوں اور ہر قسم کی محفلوں کے سمے، سواریوں کے جلوس، حمام میں نہانے کی کیفیت اور حالت، مکانوں کی آرائش، شاہانہ لباس اور جواہرات اور زیورات کا بیان، خواب گاہ کا نقشہ، جوانی کی نیند کا عالم،..... غرض کہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔''
>
> (خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمۂ شعر و شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص: ۳۴۴۔۳۴۵)

میر حسن نے منظر نگاری میں ایسی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے اُبھر کر آجاتا ہے۔ مثلاً باغ کا یہ حسین منظر دیکھیے:

گلوں کا لب نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کر گرنا خیابان پر نشے کا سا عالم گلستان پر

چمن آتش گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جزئیات نگاری:

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کی ایک اہم فنی خصوصیت جزئیات نگاری بھی ہے۔ میر حسنؔ نے ہر واقعے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لباس اور زیورات کی تفصیلات سے انھوں نے شہزادی بدر منیر کی خوب صورتی کا دل چسپ خاکہ کھینچا ہے۔ اسی طرح باغ کے بیان میں پورے منظر کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے فنی دل کشی پیدا ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ ہو رشک سے جس کے لالے کو داغ

بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

حسن بیان:

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کی خصوصیات میں سے نمایاں خصوصیت حسن بیان ہے جس میں سادگی اور بے تکلف انداز نگارش نے کمال کی دل کشی پیدا کی ہے۔ جہاں اشعار کا بے ساختہ پن اور سادہ پن دل پر اثر کرتا ہے، وہیں شعریت بھی دماغ کو مسحور کرتی ہے۔ میر حسنؔ کی سادگی میں بھی پُرکاری ہے۔ زبان کی صفائی، محاورے کا لطف، مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کا وصف نہایت عمدہ طریقے پر موجود ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار آج بھی اپنی سادگی اور صداقت کی بدولت ضرب المثل ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

میر حسنؔ نے اپنی اس مثنوی میں متروک الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا حُسن بیان متاثر ہوا ہے لیکن ایسی مثالیں کم ہیں۔ انھوں نے اپنی اس مثنوی میں ایسے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان کی یہ مثنوی آج کی بولی جانے والی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰ سال پُرانی ہونے کے باوجود اس مثنوی کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو اسے کل حاصل

تھی۔ غرض یہ کہ میر حسن کی اس مثنوی میں بلند پایہ مثنوی کی تقریباً تمام خوبیاں؛ فصاحت و بلاغت، سلیس زبان، دل کش انداز بیان، بہتر کردار نگاری، عمدہ مکالمہ نگاری، حسین جذبات نگاری، معاشرت کی خوب صورت عکاسی، دل چسپ منظر نگاری، فن کارانہ جزئیات نگاری اور محاکات نگاری وغیرہ موجود ہیں۔ اس مثنوی کی فنی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

> ''زمانے نے اس کی سحرالبیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان اور لطافت محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا کی نزاکت اور جواب سوال کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے۔ اس کی فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کیسی سنارٹ رکھی تھی۔ کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں؟ کہ جو کچھ اس وقت کہا، صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔.... خصوصاً ضرب المثل (کہاوت) کو اس خوب صورتی سے شعر میں مسلسل کرجاتے ہیں کہ زبان چٹخارے بھرتی ہے اور نہیں کہہ سکتی ہے کہ یہ کیا میوہ ہے۔ عالم سخن کے جگت گرو مرزا رفیع سودا اور شاعروں کے سرتاج میر تقی میر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں، فصاحت کے کتب خانے میں اس کی الماری پر جگہ نہ پائی۔.... میر حسن مرحوم نے لکھا اور ایسی صاف زبان، فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آب رواں، اصل واقعے کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا۔.... اس نے خواص اہلِ سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حروف تہجی بھی نہ پہچانتے تھے، وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔''
>
> (محمد حسین آزاد، آبِ حیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۲۱۱)

16.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(سحرالبیان: داستان وارد ہونے بےنظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں: منتخب اشعار)

کدھر ہے تو اے ساقی شوخ رنگ! — کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دارو کوئی تیز و تند — کہ ہوتا چلا ہے مرا ذہن کُند
مرے توسنِ طبع کو پَر لگا — مجھے یاں سے لے چل فلک پر اُڑا
سنو ایک دن کی یہ تم واردات — اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات

ہوا ناگہاں اُس کا اِک جا گزر — سُہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا — وہ جاڑے کی آمد، وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقت نور
یہ عالم جو بھایا، تو کوٹھے پہ آ — اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں تو، یاں کوئی ہے، یا نہیں
جو دیکھے تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر
کہا جی سے، اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا چل کے اِس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ، نیچے اُترا دبے پانو وہ — نظر سے بچائے ہوئے چھانو وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کا کواڑ — چلا سایہ سایہ درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گُنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھے تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے، عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طُرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
ملی جنس کی اس کو جو اپنی بُو — لگا تکنے حیرت سے حیران ہو
نظر آئی واں چاندنی کی بہار — کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
در و بام اک لخت سارے سفید — ہر اک طاق، محراب، صبحِ امید
مُعرّق زمیں پر تمامی کا فرش — جھلک جس کی لے فرش سے تا بہ عرش
زمیں کا طبق، آسماں کا طبق — سنہری، روپہری ہو جیسے ورق
بلوریں دھرے ہر طرف سنگِ فرش — کہ جس سے منوّر رہے رنگِ فرش
گئی اُس کے عالم پہ جس دم نگاہ — اور آیا نظر اس کو اک رشکِ ماہ
طرح اس کی، ہر دل کی مانوس تھی — کہ گویا وہ شیشے کی فانوس تھی
کہیں دیکھ اس کے تئیں ہوش مند — پری کو کیا ہے گا شیشے میں بند
ہر اک سمت واں نور کا اِزدحام — لگے آئنے قدِّ آدم تمام
لپٹے ہوئے بادلوں سے درخت — زمین و ہوا، صاحبِ تاج و تخت
مُلَبّب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر — پڑے چشمۂ ماہ میں جس سے لہر
لبِ نہر پہ صاف جو غور کی — تو پڑی تھی وہ ایک بلّور کی
پڑے اس میں فوّارے چھٹتے ہوئے — ہوا بیچ موتی سے لُٹتے ہوئے

مُقرّض پڑا اس پہ مقیّش جو — گرا ماہ واں رشک سے پُرزے ہو
لیے گود مقیّش چھوٹے بڑے — سبھی مہ، ستارے اڑاویں کھڑے
غرض اپنی صنعت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بناتے ہیں جوڑ
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم — مَلیں جلوۂ مہ کو زیرِ قدم
فقط چاندنی میں کہاں طَور یہ — کہ طُرّہ نہ جب تک ملے اور یہ
زمانہ زرافشاں، ہوا زرفشاں — زمیں سے لگاتا زماں زرفشاں
گل و غنچہ نسرین و تاجِ خُروس — زمینِ چمن سب جبینِ عروس
خراماں زری پوش ہر ماہ وش — کریں دیکھ کر مہر و مہ جن کو غش
کھڑا ایک نمگیرۂ زرنگار — کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
جڑاؤ وہ اِستادے الماس کے — ڈھلے ایک سانچے کے اِک راس کے
کھنچی ڈور ہر طرف زر تار کی — لڑی جوں کِناری کے ہوں ہار کی
کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھَبَن — کہ سورج کے ہو گِرد جیسے کرن
مغرّق بچھی مسند اک جگمگی — کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے — کہ تھے وے فقط حسن ہی سے بھرے
بلوریں صراحی، وہ جامِ بلور — دل و دیدہ وقف تماشاے نور
زمیں نور کی، آسماں نور کا — جدھر دیکھو اودھر سماں نور کا
چمن سارے داؤدیوں سے بھرے — جوانانِ شبّو کے ہر جا پرے
ستاروں کا مہتاب میں حال یوٗں — کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجیے سایے اوٗپر نگاہ — تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہر و ماہ
کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر — بہ جز نور، آتا نہیں کچھ نظر
کروں کون سے حسن کو انتخاب — ہر اک آئینے میں وہی ماہتاب
نظر جس طرف جائے نزدیک و دوٗر — اسی ایک مہ کا ہے ہر جا ظہور
نکل اپنی وحدت سے، کثرت میں آ — وہی نور ہے جلوہ گر جا بہ جا
نئے رنگ سے ہر طرف ماہتاب — وہی ایک نکتہ کہ جس کی کتاب
حقیقت کی لیکن بصارت بھی ہو — کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

عزیز طلبا! ابھی آپ نے میر حسنؔ کی مثنوی 'سحر البیان' کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

مذکورہ اشعار میں بدرمُنیر کے باغ میں بے نظیر کے وارد ہونے اور شاہ زادی کے عشق میں اس کے مبتلا ہونے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ پہلے کے تین اشعار میں شہزادہ بے نظیر کی دلی کیفیات کی مرقع کشی کی گئی ہے کہ تنہائی کی زندگانی سے وہ بے زار ہے اور معشوقہ کی تلاش میں اس کا دل بے قرار ہے۔ آگے کے بقیہ اشعار میں باغ میں بے نظیر کے جانے، باغ کے خوب صورت منظر اور اس حسین باغ میں شاہ زادی کے عشق میں بے نظیر کے مبتلا ہونے کے واقعے کو انتہائی دل کشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک رات کو جب بے نظیر سیر کے واسطے اٹھا اور تفریح کی غرض سے چہل قدمی کرتے ہوئے آگے نکل گیا تو اچانک ایک ایسی جگہ سے اس کا گزر ہوا جہاں اسے ایک خوب صورت باغ اور بلند و بالا عمارت دکھائی دی۔ یہاں باغ کی خوب صورتی اور عمارت کی چمک دمک کی ایسی دل چسپ مرقع کشی کی گئی ہے کہ اس باغ اور عمارت کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہاں میرحسنؔ کا فن کارانہ کمال پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس دل کش باغ کے مناظر اور ان مناظر کے درمیان عمارت کی خوب صورتی نے بے نظیر کو اپنی جانب کچھ اس طرح متوجہ کیا کہ وہ گھوڑے سے اُتر کر سر جھکا کر دیکھنے لگا۔ مارے تجسس کے جب اس نے سر جھکا کر دیکھا تو سارے خوش گوار مناظر اس کی نظروں سے محو ہوگئے۔ ایسے میں وہ ماہر عاشق کی طرح دبے پاؤں اور انتہائی آہستگی سے آگے بڑھا، کواڑ کھول کر اندر داخل ہوگیا اور چھپ کر معائنہ کرنے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ درختوں کے درمیان کوئی چاند بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے وہاں اطراف میں نظر ڈالی تو آس پاس کا منظر بہت سُہانا اور خوش نما نظر آیا۔ باغ کے اس عجیب و غریب سماں میں بے نظیر حیران و ششدر ہوگیا۔ جب پری چہرہ اور انتہائی خوب صورت چہروں پر اس کی نظر پڑی تو اس کا دل قابو سے باہر ہونے لگا۔ اسی درمیان بے نظیر کو انسانوں کی بو محسوس ہوئی۔ اسے یہ احساس ہوا کہ یہ لوگ اسی کی طرح انسان ہیں۔ ان کی خوب صورتی اور اطراف کی چکا چوند نے اسے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ بے نظیر کو باغ میں چاندنی کی بہاریں نظر آئیں جس سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ باغ میں بے نظیر کو ایسا محسوس ہوا کہ سارے بام و در حسن کی روشنی میں نہائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک طاق اور محراب صبح امید کا منظر پیش کر رہا ہے۔ سونے چاندی اور جواہرات سے بھرپور تمامی (ریشمی کپڑے کی ایک قسم جس میں سنہری تاریں ہوتی ہیں) کا فرش ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہا ہے جس کے نظارے کے لیے فرش تا عرش سب منتظر ہیں۔ زمین اور آسمان کی سطح یا پرت اس طرح سے چمک رہی ہے جیسے سفید چاندی چمکتی ہے۔ فرش پر ہر طرف بلور یعنی ایسا شفاف اور چمکیلا جوہر جو شیشے سے سخت اور زمرد سے نرم ہوتا ہے، بچھایا گیا ہے تاکہ فرش پوری طرح روشن رہے۔ جب بے نظیر کی نظریں ہر ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں تو اسی درمیان بے نظیر کو ایک ایسا حسین چہرہ نظر آیا جس پر چاند بھی رشک کرے یعنی خوب صورتی میں وہ رشک ماہ یکتا و یگانہ تھی۔ اس کی اداؤں اور طور طریقوں سے محفل میں سبھی مانوس تھے۔ اس کا حسن اس قدر نکھرا ہوا تھا جیسے شیشے کا فانوس روشنی پھیلاتا ہے۔ عقل و خرد والے اس کے حسن کو دیکھ کر ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی پری ہے جسے شیشے میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہاں فن کارانہ جزئیات نگاری کے ذریعے باغ کی خوب صورتی کی دل چسپ مصوری کی گئی ہے۔ باغ اتنا خوب صورت ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جانب بس نور ہی نور ہے۔ ہر طرف

قدِ آدم آئینے لگے ہوئے ہیں۔ بادلوں نے درختوں کو اپنے آغوش میں لے رکھا ہے۔ باغ کی خوب صورتی کے اس منظر کو دیکھ کر زمین، ہوا اور تخت و تاج کے مالک سبھی بے خود اور حیران ہیں۔ چوپڑ کی طرح دکھائی دینے والی پاکیزہ نہر بھی لبریز ہے۔ اس نہر میں فوارے رواں ہیں جو موتیوں کی شکل میں ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور ہوا میں وہ جگنو کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاند کا جلوہ قدموں میں اُتر آیا ہے۔ یہ سب اس کے حسن کا کمال ہے جس نے چاندنی کو یہ طرہ بخش دیا ہے کہ وہ بھی نظروں کو حسن اور سکون بخش رہی ہے۔ زمین سے آسمان تک بس نوٗر ہی نوٗر پھیلا ہوا ہے۔ پھول اور غنچے سبھی مدہوش ہیں۔ زمین دلہن بنی ہوئی ہے جو پوری طرح سجی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ سبھی حسینائیں زربفت پہنے ہوئے ناز و ادا کے ساتھ چل رہی ہیں جنھیں سورج اور چاند بھی دیکھ لیں تو غش کھا کر گر جائیں۔ نم گیر پر جو موتی ٹانکے گئے ہیں، وہ بھی اس کی چمک دمک پر قربان ہو رہے ہیں۔ الماس کے جڑاو ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ ہر جانب سونے کی تار کی ڈوریاں کھنچی ہوئی ہیں اور کناروں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہار کی لڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ جھالر کی چمک سورج کی روشنی کو ماند کر رہی ہے۔ باغ میں جو مسند لگی ہوئی ہے، وہ بھی جگمگا رہی ہے اور اس کے قدموں میں ایسا لگتا ہے جیسے چاندنی بچھا دی گئی ہے۔ روشنی نے ایسا سماں بنایا ہے کہ ہر طرف چاندنی کا گمان ہو رہا ہے۔ مسند پر رکھے تکیے بھی خوش ہیں کیوں کہ سارا حسن ان کے ارد گرد موجود ہے۔ شیشے کی صراحیاں اور جام بلور کا دور چل رہا ہے۔ دل اور نگاہ فقط نور کا تماشائی بنا ہوا ہے۔ زمین پر ہر جانب نوٗر پھیلا ہوا ہے اور آسمان بھی نوٗر کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یعنی ہر طرف نوٗر ہی نوٗر ہے۔ ایسے میں حسن کا انتخاب بہت مشکل ہو گیا ہے کیوں کہ جس جانب بھی نظر جا رہی ہے، ہر آئینے میں اسی ماہتاب کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ دوٗر اور نزدیک بس اسی چاند کا ظہور ہے۔ اس کے حسن کے سامنے سبھی حسین کم تر نظر آ رہے ہیں۔ ایسے میں اب اپنے اکیلے پن سے نکل کر کثرت میں آنے کا وقت آ گیا ہے کیوں کہ ایک ہی نوٗر ہر جگہ جلوہ نما ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تنہائی سے نکل کر اس کی قربت حاصل کی جائے۔ نئے رنگ رُوٗپ سے ہر جانب ماہتاب روشنی پھیلا رہی ہے۔ محبوب کتاب کی مانند اپنی روشنی سے ہر ایک کو منور کر رہا ہے۔ حقیقت میں اسے دیکھنے کے لیے اس بصارت کی ضرورت ہے جو یکسوئی اور وحدت کی قائل ہو، تاکہ اس کے سوا کسی غیر کو دیکھنے کے بارے میں خیال بھی نہ آئے اور یہی دراصل محبوب کے لیے اعتراف محبت ہے۔ مذکورہ اشعار میں شاعر میر حسنؔ نے پورے فن کارانہ کمال کے ساتھ مناظر و کیفیات کی مصوری کی ہے اور تفصیلات و جزئیات کو بیان کیا ہے۔

16.3.4 ماحصل

میر حسنؔ کا اصلی نام 'میر غلام حسن' اور تخلص 'حسنؔ' تھا۔ ان کے والد کا نام میر غلام حسین ضاحکؔ تھا جو اپنے وقت کے بڑے ہجوگو شاعر تھے۔ میر حسنؔ کے جدِ اعلیٰ عہد شاہجہانی کے اواخر میں ہرات سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ میر حسنؔ کی ولادت پرانی دلی کے محلّہ سید واڑہ میں ہوئی۔

ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۲۷ء بیان کی جاتی ہے۔ میر حسنؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ انھیں بچپن ہی سے شعر وشاعری سے شغف پیدا ہو گیا تھا اور فارسی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں وہ اپنا کلام اپنے والد کو دکھایا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے خواجہ میر دردؔ کی شاگردی اختیار کی۔ جب دہلی میں ہنگامہ برپا ہوا تو دیگر شرفا کے ساتھ میر حسنؔ کے والد میر ضاحکؔ نے بھی اہل وعیال کے ساتھ دہلی کو خیرباد کہا۔ دہلی سے نکلنے کے بعد وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے۔ فیض آباد ہی میں میر حسنؔ اُردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں پہلے انھوں نے میر ضیاء الدین ضیاؔ پھر مرزا محمد رفیع سوداؔ سے کلام پر اصلاح لی۔ میر حسنؔ نے بیش تر اصناف سخن؛ مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رُباعی، قطعات اور مخمس وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُردو شاعری میں ان کو اصل شہرت ومقبولیت مثنوی نگاری سے ملی۔ وہ اُردو کے بلند پایہ مثنوی نگار ہیں۔ ان سے بارہ مثنویاں یادگار ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ 'نقل کلاونت'، 'نقل زن فاحشہ'، 'ہجو قصائی'، 'نقل قصائی'، 'مثنوی شادی آصف الدولہ'، 'رموز العارفین'، 'مثنوی ہجو حویلی'، 'گلزار ارم'، 'مثنوی در تہنیت عید'، 'مثنوی قصر جواہر'، 'مثنوی در خوان نعمت' اور 'مثنوی 'سحر البیان'۔ ان میں سے 'گلزار ارم'، 'سحر البیان' اور 'رموز العارفین' طویل مثنویاں ہیں جب کہ ان کی دیگر مثنویاں مختصر ہیں۔ میر حسنؔ کا ایک اہم ادبی کارنامہ 'تذکرہ شعرائے اُردو' ہے۔ یہ تذکرہ انھوں نے فارسی زبان میں لکھا ہے جس میں انھوں نے تقریباً تین سو شعرا کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں۔ میر حسنؔ نے تقریباً ساٹھ ۶۰ برس کی عمر پا کر ۱۷۸۶ء میں وفات پائی۔ میر حسنؔ نے اگر چہ کئی مثنویاں لکھیں لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ان کی آخری مثنوی 'سحر البیان' کو ملی۔ اس یادگار مثنوی کی وجہ سے اُردو مثنوی کی روایت میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے مستند ہو گیا۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے قصے میں کوئی جدت نہیں ہے لیکن میر حسنؔ کے اندازِ بیان نے اسے جدت و نُدرت کا حامل بنا دیا ہے۔ میر حسنؔ کی اس مثنوی میں بلند پایہ مثنوی کی تقریباً تمام خوبیاں؛ فصاحت و بلاغت، سلیس زبان، دل کش انداز بیان، بہتر کردار نگاری، عمدہ مکالمہ نگاری، حسین جذبات نگاری، معاشرت کی خوب صورت عکاسی، دل چسپ منظر نگاری، فن کارانہ جزئیات نگاری اور محاکات نگاری وغیرہ موجود ہیں۔ اس مثنوی میں اس زمانے کی حالت، معاشرہ کے رنگ ڈھنگ، رہن سہن کے طور طریقوں، لباس، رسم ورواج، زندگی کے مشاغل، تہذیب وتمدن، زیورات، شادی بیاہ کی رسوم، درباروں کی دھوم دھام، محلات، شہزادوں کی ولادت پر خوشی اور جشن، نذر و نیاز اور تحائف وغیرہ کی ایسی دل چسپ تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ مثنوی شاہانِ اودھ کی درباری زندگی کا حسین مرقع معلوم ہوتی ہے۔

16.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- میر حسنؔ کے سوانحی احوال وکوائف اور ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔
- میر حسنؔ کی مثنوی نگاری سے بحث کی۔
- میر حسنؔ کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

16.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میر حسنؔ کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ میر حسنؔ کی مثنویوں کے نام بتائیے۔

۳۔ میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کی امتیازی خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

۴۔ میر حسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' میں معاشرت کی عکاسی سے مختصراً بحث کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

نکل اپنی وحدت سے کثرت میں آ ۔۔۔ وہی نوٗر ہے جلوہ گر جا بہ جا

نئے رنگ سے ہر طرف ماہتاب ۔۔۔ وہی ایک نکتہ کہ جس کی کتاب

حقیقت کی لیکن بصارت بھی ہو ۔۔۔ کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

16.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میر حسنؔ کا اصلی نام 'میر غلام حسن' اور تخلص 'حسنؔ' تھا۔ ان کے والد کا نام میر غلام حسین ضاحکؔ تھا جو اپنے وقت کے بڑے ہجو گو شاعر تھے۔ میر حسنؔ کے جدِ اعلیٰ عہدِ شاہجہانی کے اواخر میں ہرات سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ میر حسنؔ کی ولادت پرانی دلی کے محلّہ سید واڑہ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۲۷ء بیان کی جاتی ہے۔ میر حسنؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والدِ محترم سے حاصل کی۔ انھیں بچپن ہی سے شعروشاعری سے شغف پیدا ہو گیا تھا اور فارسی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں وہ اپنا کلام اپنے والد کو دکھایا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے خواجہ میر دردؔ کی شاگردی اختیار کی۔ جب دہلی میں ہنگامہ برپا ہوا تو دیگر شرفا کے ساتھ میر حسنؔ کے والد میر ضاحکؔ نے بھی اہل وعیال کے ساتھ دہلی کو خیرباد کہا۔ دہلی سے نکلنے کے بعد وہ

لکھنؤ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے۔ فیض آباد ہی میں میر حسؔن اُردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں پہلے انھوں نے میر ضیاء الدین ضیؔا پھر مرزا محمد رفیع سودؔا سے کلام پر اصلاح لی۔ میر حسؔن نے تقریباً ساٹھ ۶۰ برس کی عمر پا کر ۱۷۸۶ء میں وفات پائی۔

۲۔ میر حسؔن سے بارہ مثنویاں یادگار ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ 'نقل کلاونت'، 'نقل زن فاحشہ'، 'ہجو قصائی'، 'نقل قصائی'، 'مثنوی شادی آصف الدولہ'، 'رموز العارفین'، 'مثنوی ہجو حویلی'، 'گلزار ارم'، 'مثنوی در تہنیت عید'، 'مثنوی قصر جواہر'، 'مثنوی در خوان نعمت' اور 'مثنوی سحر البیان'۔

۳۔ میر حسؔن کی مثنوی 'سحر البیان' میں بلند پایہ مثنوی کی تقریباً تمام خوبیاں؛ فصاحت وبلاغت، سلیس زبان، دل کش انداز بیان، بہتر کردار نگاری، عمدہ مکالمہ نگاری، حسین جذبات نگاری، معاشرت کی خوب صورت عکاسی، دل چسپ منظر نگاری، فن کارانہ جزئیات نگاری اور محاکات نگاری وغیرہ موجود ہیں۔

۴۔ میر حسؔن کی مثنوی 'سحر البیان' میں اس زمانے کی حالت، معاشرہ کے رنگ ڈھنگ، رہن سہن کے طور طریقوں، لباس، رسم ورواج، زندگی کے مشاغل، تہذیب وتمدن، زیورات، شادی بیاہ کی رسوم، درباروں کی دھوم دھام، محلات، شہزادوں کی ولادت پر خوشی اور جشن، نذر و نیاز اور تحائف وغیرہ کی ایسی دل چسپ تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ مثنوی شاہانِ اودھ کی درباری زندگی کا حسین مرقع معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ مذکورہ اشعار میں عاشق شہزادہ بے نظیر کے دلی محسوسات اور عشقیہ کیفیات کو بیان کیا گیا ہے کہ اب اپنے اکیلے پن سے نکل کر کثرت میں آنے کا وقت آ گیا ہے کیوں کہ ایک ہی نُور ہر جگہ جلوہ نما ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تنہائی سے نکل کر اس کی قربت حاصل کی جائے۔ نئے رنگ رُوپ سے ہر جانب ماہتاب روشنی پھیلا رہی ہے۔ محبوب کتاب کی مانند اپنی روشنی سے ہر ایک کو منور کر رہا ہے۔ حقیقت میں اسے دیکھنے کے لیے اس بصارت کی ضرورت ہے جو یکسوئی اور وحدت کی قائل ہو، تا کہ اس کے سوا کسی غیر کو دیکھنے کے بارے میں خیال بھی نہ آئے اور یہی دراصل محبوب کے لیے اعتراف محبت ہے۔

16.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
ہجو گو	:	مذمت پر مبنی شعر کہنے والا، ہجو کہنے والا
جدِ اعلیٰ	:	مورث اعلیٰ، بڑے دادا، داداؤں کے دادا

سکونت	:	قیام، پڑاؤ، اقامت
شغف	:	بہت زیادہ لگاؤ، پسندیدگی، لگن
تہنیت	:	مبارک باد، مبارک سلامت
متروک	:	چھوڑا ہوا، ترک کیا ہوا
سحر سامری	:	سامری کا جادو، مراد گمراہ کن
فصیح	:	صاف، واضح، خوش بیان، شیریں کلام شاعر یا ادیب
فصاحت	:	پُرکشش اندازِ بیان، کلام کا معیاری اور مستند محاورے کے مطابق ہونا
بلاغت	:	مقتضائے حال کے موافق کلام کرنا، خوش بیانی
مُقَیَّش	:	سونے چاندی کے تاروں کی مدد سے بنا ہوا کپڑا، زربفت
مُلَبَّب	:	لبالب، بھرا ہوا، لبریز، پُر
زَرفشاں	:	چمک دار، چمکیلا، درخشاں
زَرافشاں	:	طلائی، سنہرے رنگ کا، چمک دار
نسرین	:	ایک خوش بودار پھول
حَمّام	:	نہانے کی جگہ، غسل، نہانا، غسل خانہ
الماس	:	ہیرا
بلوریں	:	بلور کا بنا ہوا، صاف و شفاف، چمک دار
مُغَرَّق	:	سونے چاندی یا جواہرات میں لدا، جگمگاتا ہوا
خِیرگی	:	چکاچوند پیدا کرنے کی کیفیت، چکاچوند
تَوسَن	:	وہ گھوڑا جو تند و شوخ ہو
کُند	:	تیز کی ضد، سُست، کاہل
گُنجان	:	گھنا، بھرا بھرا، شاخ در شاخ
واردات	:	سرگذشت، ماجرا، حال، دل پر بیتی حالت
سماں	:	نظارہ، منظر، موقع، کیفیت، حالت
طُرفہ	:	نادر، انوکھا، عجیب، نیا
طَبَق	:	سونے کا ورق
اِزدِحام	:	بھیڑ، مجمع، ہجوم، جمگھٹ

16.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	مثنوی سحرالبیان	:	میر حسنؔ
۲۔	اُردو مثنوی شمالی ہند میں	:	ڈاکٹر گیان چند جین
۳۔	اُردو مثنوی کا ارتقا	:	پروفیسر عبدالقادر سروری
۴۔	اُردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)	:	سید محمد عقیل رضوی
۵۔	اُردو کی بہترین مثنویاں	:	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۶۔	اُردو کی تین مثنویاں	:	پروفیسر خان رشید

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 17 پنڈت دیا شنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
(گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)

ساخت

17.1 اغراض و مقاصد

17.2 تمہید

17.3 پنڈت دیا شنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

17.3.1 پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال و کوائف

17.3.2 پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری

17.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

17.3.4 ماحصل

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

17.5 اپنا امتحان خود لیجیے

17.6 سوالوں کے جوابات

17.7 فرہنگ

17.8 کتب برائے مطالعہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

17.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے۔
- پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

17.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار ملا وجہی، نصرتی، ابن نشاطی اور میر حسن کے سوانحی

احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات اور فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے اور ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔ ساتھ ہی ان کی مشہور مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

17.3 پنڈت دیا شنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

17.3.1 پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال و کوائف

پنڈت دیا شنکر نسیم کے حالاتِ زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ پنڈت برج نرائن چکبستؔ کے مضامین کے علاوہ اُردو کے کسی تذکرے میں ان کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہیں۔ رشید حسن خاں نے بھی 'گلزارِ نسیم' کے مقدمہ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی زندگی سے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں، اس کے ماخذ بھی چکبستؔ کے مضامین ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصل نام پنڈت دیا شنکر کول اور تخلص نسیم تھا۔ والد بزرگوار کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔ نسیم کی پیدائش ۱۸۱۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کا خاندان کشمیری پنڈتوں کا معزز خاندان تھا جس پر ہند اسلامی تہذیب و معاشرت کا اثر بہت گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاندان میں فارسی اور اُردو زبان کی تعلیم برسوں سے رائج تھی اور ان کا طرز زندگی ہندوستانی مسلمانوں سے بہت قریب تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے زمانے کے رواج کے مطابق اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد شاہی فوج میں بہ حیثیت کلرک ان کا تقرر ہوا اور غالباً شعبۂ مالیات کے حساب کتاب کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ یہ نوابین اودھ میں سے غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ اس عہد میں لکھنؤ میں خوش حالی تھی جس کی وجہ سے شعر و ادب کی پُر رونق محفلیں آباد تھیں۔ ایسے ماحول میں نسیم نے کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصہ مذاق پیدا کر لیا تھا۔ انھوں نے شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش جیسے بلند پایہ شاعر کی شاگردی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و بیان کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اُردو روزمرہ اور محاورات پر انھیں عبور حاصل ہوگیا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کو شروع میں غزل گوئی کا شوق تھا۔ غزل میں انھوں نے اسی رنگ سخن کی پیروی کی جو اس وقت لکھنؤ میں رائج تھا لیکن بہت جلد جدت طبع نے انھیں مثنوی کی طرف مائل کیا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے کم عمر پائی۔ کم عمری میں انھیں بیماری لاحق ہوئی جس نے انھیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی بیماری ان کی وفات کا سبب بنی۔ ان کی تاریخ ولادت میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ان کی تاریخ وفات کے سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ اس تضاد کی بنیاد چکبستؔ کے مختلف مضامین ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ نسیم کا انتقال بتیس سال کی عمر میں ۱۸۴۲ء میں ہوا لیکن اُردو کے مشہور محقق رشید

حسن خاں کی تحقیق کے مطابق نسیم نے ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

پنڈت دیاشنکرنسیم نے حمد، نعت، غزل، مخمس، ترجیع بند اور واسوخت، غرض مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُردو شعروادب میں ان کو ممتاز مثنوی نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ان کی مثنوی 'گلزارنسیم' کو میرحسنؔ کی مثنوی 'سحرالبیان' کے بعد بے پناہ شہرت ومقبولیت ملی۔ یہ مثنوی نسیم نے اٹھائیس برس کی عمر میں تصنیف کی تھی لیکن اس کی اشاعت لکھنؤ کے مطبع حسنی میرحسن رضوی سے ۱۸۴۴ء میں عمل میں آئی، تب نسیم کی عمر ۳۳ برس کی تھی۔ ان کی دوسری مشہور تصنیف 'دیوان نسیم' ہے، جس میں ان کی تقریباً مکمل ونامکمل ۴۸ غزلیں، پانچ مخمس، دو ترجیع بند، ایک واسوخت، تین خمسے (فارسی) اور چند متفرقات شامل ہیں۔ بہ طور نمونہ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا
آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

میں بوسہ لوں گا بہانے بتایئے نہ مجھے
جو دل لیا ہے تو قیمت دلایئے نہ مجھے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

17.3.2 پنڈت دیاشنکرنسیم کی مثنوی نگاری

پنڈت دیاشنکرنسیم نے اگرچہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اُردو شعروادب میں ان کو اصل پہچان مثنوی نگار کی حیثیت سے ملی۔ انھوں نے 'گلزارِنسیم' جیسی شاہ کار مثنوی لکھی جس نے انھیں حیات جاوید عطا کی اور یہی وہ مثنوی ہے جسے دبستان لکھنؤ کی شاعری کی پہلی طویل نظم ہونے کا شرف حاصل ہے۔نسیم کی اس مثنوی کو قارئین کی بڑی توجہ حاصل ہوئی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اُردو میں جن دو مثنویوں کو سب سے زیادہ شہرت ملی، ان میں میرحسنؔ کی 'سحرالبیان' اور دیاشنکرنسیم کی 'گلزارِنسیم' کا شمار ہوتا ہے۔ان دونوں مثنویوں میں فکروفن کے لحاظ سے کچھ مماثلتیں ہیں تو کچھ امتیازات بھی ہیں۔ بقول مولانا محمد حسین آزادؔ "ہمارے ملکِ سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے ہیں جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک 'سحرالبیان' دوسرے 'گلزارِنسیم' اور تعجب یہ کہ دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں"۔ 'سحرالبیان' میں سادگی کا حسن ہے تو

'گلزارِ نسیم' میں پُرکاری کا جادو ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ اس مثنوی کی تصنیف کے دوران شاگرد کو قدم قدم پر استاد کی رہنمائی حاصل رہی۔ پہلے یہ مثنوی بہت طویل تھی۔ آتش کی ہدایت پر ہی نسیم نے اس مثنوی کو مختصر کر کے نئے سرے سے لکھا اور ایجاز واختصار سے بھرپور ایک مکمل تخلیق پیش کرنے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ نسیم کی یہ مثنوی پہلی بار ۱۸۴۴ء میں لکھنؤ کے مطبع حسنی میر حسن رضوی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا اصل قصہ فارسی زبان میں ہے جس کو عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں نہال چند لاہوری نے اس فارسی قصے کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا جس کو دیا شنکر نسیم لکھنوی نے 'گلزارِ نسیم' کے عنوان سے مثنوی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ تاج الملوک اور بکاؤلی کی عشقیہ کہانی پر مبنی ایک عشقیہ مثنوی ہے جو 'قصۂ گل بکاؤلی' کے نام سے بھی معروف ہے۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا پلاٹ:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا پلاٹ مکمل طور پر فرضی ہے۔ یہ مثنوی یورپ کے بادشاہ زین الملوک اور اس کے بیٹوں کی زندگی کی بازگشت ہے۔ اس مثنوی کی کہانی اس طرح عمل میں آتی ہے کہ ایک بادشاہ جس کا نام زین الملوک ہے، کے چار بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پانچواں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام تاج الملوک رکھا گیا۔ اس بیٹے کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ اگر بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بینائی سے محروم ہو جائے گا اور ایک دن ایسا ہی ہوا۔ ایک طبیب نے مشورہ دیا کہ گلزارِ ارم میں بکاؤلی نام کا ایک پھول ہے جسے بادشاہ کی آنکھوں سے لگایا جائے تو بینائی لوٹ سکتی ہے۔ یہ سن کر پہلے چاروں بیٹے پھول کی تلاش میں نکلے لیکن راستے میں دلبر بیسوا چوسر میں ہرا کر چاروں کو قید کر لیتی ہے۔ بعد میں پانچواں بیٹا تاج الملوک پھول کی تلاش میں نکلتا ہے۔ دلبر بیسوا کو ہرا کر آگے بڑھتا ہے تو اس کا مقابلہ ایک دیو سے ہوتا ہے۔ تاج الملوک اسے شکست دیتا ہے۔ دیو کی بہن حمالہ کی مدد سے وہ گلزارِ ارم پہنچتا ہے اور بکاؤلی کا پھول توڑ لاتا ہے۔ واپسی میں تاج الملوک کی ملاقات چاروں بھائیوں سے ہوتی ہے۔ چاروں بھائی دھوکے سے تاج الملوک سے پھول چھین کر بادشاہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ پھول بادشاہ کی آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور بادشاہ کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آتی ہے۔ اسی پلاٹ کے اردگرد قصے کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ اس طرح مثنوی 'گلزارِ نسیم' داستان کی طرز پر مثنوی کی ہیئت میں وجود میں آئی جو اپنے دور کی ایک شاہکار تخلیق ثابت ہوئی۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' میں پرستان میں شہزادہ تاج الملوک کی مہمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جب وہ گل بکاؤلی کی تلاش کی مہم میں نکلا تو اپنی اس مہم کے دوران تاج الملوک بکاؤلی (پری) کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بکاؤلی جب محوِ خواب تھی، اسی وقت اس نے پھول بھی چُرا لیا اور اس سے انگشتری بھی بدل لی۔ بکاؤلی مرد کا بھیس بدل کر تاج الملوک کو تلاش کر لیتی ہے۔ بکاؤلی کی ماں رقیب کا کردار ادا کرتی ہے اور دونوں کو جدا کر دیتی ہے۔ طلسماتی جنگلوں میں کئی معرکوں کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ داستان یہاں

پنڈت دیا شنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)

ایک دوسرا موڑ لیتی ہے۔ راجہ اندر دربار میں بکاؤلی کو طلب کر کے سزا کے طور پر اس کا آدھا دھڑ پتھر کا بنا کر قید کر دیتے ہیں۔ اس درمیان راجہ اندر کی بیٹی شہزادی چترا وت تاج الملوک سے عشق کرنے لگتی ہے اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بکاؤلی کا عاشق ہے اور اس کی طرف مائل نہ ہوگا، بکاؤلی کو آزاد کرانے میں شہزادے کی مدد کرنے لگتی ہے۔ حالات کچھ یوں بنتے ہیں کہ بکاؤلی کو دوسری زندگی عطا کی جاتی ہے اور وہ سترہ برس کے بعد شہزادے سے مل جاتی ہے۔ اس داستان کے اندر ایک اور داستان وزیر کے بیٹے بہرام اور حسن آرا کے عشق کی بھی ہے۔ اس پے چیدہ پلاٹ کو نظم کرنے کے لیے پنڈت دیا شنکر نسیم نے جس بحر کا انتخاب کیا، اس کو ٹھہر ٹھہر کر ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ انھوں نے یہ بحر دانستہ طور پر منتخب کی ہوگی تا کہ لوگ دھیرے دھیرے الفاظ پر غور کر کے پڑھیں اور اس کے لفظی محاسن کا پورا لطف اٹھا سکیں۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی خصوصیات و امتیازات اور اس کی فنی انفرادیت:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک خصوصیت اس کے پلاٹ کی پے چیدگی ہے۔ اس کا قصہ اصلاً ہندوستانی ہے مگر اس میں مختلف کہانیوں کے عناصر ملتے ہیں۔ اس چھوٹی سی داستان میں ہند ایرانی مشترکہ تہذیبی اور مذہبی روایات کا عکس جا بہ جا نمایاں ہے۔ مثنوی حقیقت میں بیانِ ماجرا ہے۔ مثنوی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اس کی زبان اور بیان کی سطح میں سلاست اور روانی کو پیش نظر رکھا جائے تا کہ قاری کی دل چسپی کسی بھی طور سے کم نہ ہو اور وہ اس کی گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مثنوی 'گلزارِ نسیم' میں خوبی کے ساتھ ساتھ ایک نقص بھی نظر آتا ہے۔ چوں کہ مثنوی 'گلزارِ نسیم' دیگر مثنویوں کی بہ نسبت پے چیدہ ہے، اس کا تمام قصہ فرضی، خیالی اور طلسماتی ہے، اس لیے پنڈت دیا شنکر نسیم نے الفاظ کے انتخاب، طرز بیان، رعایت لفظی اور دیگر صنائع و بدائع کے استعمال میں فنی ہنرمندی کا مظاہرہ تو کیا ہے لیکن ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے تفصیل کی جگہ اختصار سے کام لیا ہے اور جہاں اشارات سے کام چل سکتا تھا، وہاں انھوں نے داستان کو پھیلا دیا ہے۔ مثنوی کی ساخت یوں رکھی گئی ہے کہ پہلے حمد پھر نعت رسولؐ، پھر مناقب آل محمدؐ اور اس کے بعد مناسب گریز کر کے اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔

کردار نگاری:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ اس میں دیا شنکر نسیم نے کئی کردار پیش کیے ہیں۔ کچھ کردار انسانی ہیں تو کچھ مافوق الفطری کردار ہیں۔ ان میں یورپ کا بادشاہ زین العابدین، اس کا پانچواں بیٹا تاج الملوک، دلبر نامی بیسوا، دیو، حمالہ دیونی (دیو کی بہن)، حمالہ کے پاس محمودہ نامی آدم زاد لڑکی، نابینا جوگی، بکاؤلی، بکاؤلی کی ماں جمیلہ، روح افزا پری، روح افزا کی ماں حسن آرا، راجہ اندر، چترا وت، سراندیپ (سنگلدیپ) کی رانی، تاج الملوک کے وزیر کا بیٹا بہرام، دلبر بیسوا کا غلام ساعد وغیرہ ہیں۔

تاج الملوک: تاج الملوک مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا ہیرو ہے۔ اس کے گرد مثنوی کے سارے واقعات گردش کرتے ہیں۔ تاج الملوک ایک بدقسمت شہزادہ ہے کیوں کہ اس کی پیدائش کے بعد جب اس پر باپ کی نظر پڑتی ہے تو وہ نابینا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسے ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔ تاج الملوک بدقسمت ضرور ہے لیکن وہ ایک حساس اور فرض شناس انسان ہے۔ چنانچہ جب بادشاہ کی بینائی جاتی رہی تو چاروں شہزادے گل بکاؤلی کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تاج الملوک نے بھی اسے اپنا فرض سمجھا اور گل بکاؤلی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ تاج الملوک ایک ذہین اور بہت موقع شناس شہزادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں چاروں بھائی کم عقل لیکن عیّار ہیں۔ جب تاج الملوک گل بکاؤلی کی تلاش میں سلطنت ارم کی سرحد تک پہنچا تو سرحد کا دیو انھیں کھانے کو دوڑا لیکن وہ خود کو بچا لیتا ہے۔ تاج الملوک بہت حوصلہ مند اور باہمت نوجوان تھا۔ اس نے گل بکاؤلی کو حاصل کرنے کے لیے بے شمار مصائب اٹھائے مگر ہمت نہیں ہاری۔ جب اس کے بھائیوں نے دھوکے سے اس سے گل بکاؤلی چھین لیا تو اس نے ہمت ہارنے کی بجائے ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور آخر میں اس کو اس کا صلہ بھی ملا۔ غرض یہ کہ تاج الملوک میں بے پناہ خوبیاں ہیں۔ اس لیے وہ پوری مثنوی میں چھایا ہوا رہتا ہے۔

بکاؤلی: بکاؤلی ایک بہت ہی خوب صورت پری اور مثنوی 'گلزار نسیم' کی ہیروئن ہے۔ اس کا حسن چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ پھول اسی کے باغ میں تھا جس کے بارے میں طبیب نے بتایا تھا کہ اس سے بادشاہ کی آنکھوں کی روشنی واپس آ جائے گی۔ بکاؤلی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہین اور ہوشیار ہے۔ جب اس کا پھول چُرایا گیا تو وہ اس کی تلاش میں مرد کے بھیس میں گھر سے نکلی۔ آخر کار زین الملوک کے شہر میں داخل ہو گئی۔ بادشاہ کے پوچھنے پر اس نے خود کو فرخ اور باپ کا نام فیروز بتایا۔ بادشاہ نے اسے شہزادہ جان کر اپنا وزیر بنا لیا۔ بکاؤلی ایک وفادار بیوی بھی ہے۔ جب تاج الملوک وطن روانہ ہو رہا تھا تو بکاؤلی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے والدین سے اجازت چاہی۔ بکاؤلی آخر وقت تک تاج الملوک کو نہیں بھولی اور اس نے اس کا ساتھ دیا۔ جب اس نے دہقان کے گھر میں دوبارہ جنم لیا تب اس نے تاج الملوک سے دوبارہ شادی کی۔ غرض یہ کہ بکاؤلی اپنے حسن، اپنی عقل مندی اور وفاداری کی بنا پر ایک کامیاب ہیروئن نظر آتی ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے سارے کردار اگرچہ بڑی حد تک مصنوعی اور بناوٹی ہیں تاہم وہ تمام کردار اپنی اپنی منفرد خصوصیات کے حامل ہیں اور قصے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

مکالمہ نگاری:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک خوبی اس کی مکالمہ نگاری ہے۔ اس میں کئی مقامات پر مکالمے بھی ملتے ہیں۔ چلتی ہوئی کہانی کے بہاؤ میں مکالمے کو برتنا یقینی طور پر مشکل کام ہے لیکن دیا شنکر نسیم نے قصے میں کئی جگہ اپنے فنی کمال کا ثبوت دیتے ہوئے مکالمے پیش کیے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

بولی وہ کہ نام کیا ہے تیرا؟ فرزند اسی شکل کا تھا میرا
بولا وہ کہ نام تو نہیں یاد طفلی میں ہوا ہوں خانہ برباد
لیکن یہ میں جانتا ہوں دلگیر مادر تھی مری ایسی ہی پیر

جذبات نگاری:

مثنوی 'گلزارِنسیم' کی ایک خصوصیت کرداروں کے جذبات کی دل چسپ عکاسی ہے۔ دراصل پنڈت دیاشنکر نسیم کو جذبات نگاری میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مثنوی کے مختلف کرداروں کے جذبات کی عکاسی نہایت خوبی سے کی ہے۔ جب بکاؤلی دیکھتی ہے کہ اس کی انگوٹھی بدلی ہوئی ہے تو وہ غصے کا اظہار اس طرح کرتی ہے:

ہاتھوں کو ملا، کیا ہیہات! خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہے ہاتھ لگایا وہ ہاتھ لگے کہیں، خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے کھال اس کی جو کھینچے سزا ہے

مذکورہ اشعار میں بکاؤلی کے جذبات کو صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کیوں کہ ایسے موقع پر بکاؤلی کو سخت غصہ کا آنا بالکل فطری امر ہے۔ جذبات نگاری کی ایسی ہی حسین تصویریں مثنوی 'گلزارِنسیم' میں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

معاشرت کی تصویر کشی:

مثنوی 'گلزارِنسیم' کی ایک اہم خصوصیت معاشرت کی تصویر کشی ہے۔ یہ صرف تاج الملوک اور بکاؤلی یا صرف ایک پھول حاصل کرنے کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں کئی کہانیاں شامل ہوگئی ہیں۔ ان کہانیوں کے پردے میں اس مثنوی میں نوابینِ اودھ کے عہد کی تہذیب و تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔ دراصل پنڈت دیاشنکر نسیم نے نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، نواب محمد علی شاہ اور نواب امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس عہد میں لکھنؤ میں جو رسم و رواج عام تھے، اسی کی جھلک نسیم نے اپنی اس مثنوی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی 'گلزارِنسیم' خاص لکھنوی ماحول اور تہذیب و تمدن کی عکاس نظر آتی ہے۔ چوں کہ لکھنؤ کے نوابی ماحول میں مردوں پر عورتوں کو برتری حاصل تھی، اسی لیے بہت سے نسوانی کردار داستان پر حاوی نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ کے عیش پرستانہ ماحول نے جو آزادیاں عطا کی تھیں، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نسیم نے عریاں مناظر کو بھی لطف

اور چٹخارے لے لے کر بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی اس مثنوی کا اخلاقی پہلو بھی بلند ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری ''لکھنؤ کے آخری ایام کے شائستہ ترین مذاق کی یہ ادبی یادگار بھی 'سحرالبیان' کے دوش بدوش زندہ رہے گی''۔

منظر نگاری:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک خصوصیت منظر نگاری ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کو منظر نگاری پر پورا عبور حاصل تھا لیکن مثنوی کو مختصر کرنے کے سلسلے میں بعض جگہوں پر اس میں کمی نظر آنے لگتی ہے۔ اگر وہ اپنی مثنوی کو پوری طوالت کے ساتھ پیش کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔ اس کے باوجود 'گلزارِ نسیم' میں عمدہ منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں۔ نسیم نے مناظر اور کیفیات دونوں کی مصوری کی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار دیکھیے:

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سایے کو پتّا نہ تھا شجر کا عنقا، تھا نام جانور کا

مرغانِ ہوا تھے ہوشِ راہی نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی

راجہ جب لونڈیوں سے سوال کرتا ہے تو لونڈیوں کو مناسب جواب نہ سوجھنے پر ان کی کیا کیفیت ہوئی، اس کا منظر درج ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو:

آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی منہ پھیر کے ایک مسکرائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

منظر نگاری کی ایک اور دل چسپ مثال دیکھیے جب تاج الملوک پریوں کے کپڑے چرا لیتا ہے اور وہ شرمائی شرمائی بدن کو چراتی آگے بڑھتی ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں باہر بصد آب و تاب آئیں

پوشاک دھری ہوئی نہ پائی جانا کہ حریف نے اڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں رُک رُک کے قدم اٹھاتی آئیں

اس طرح کی حسین منظر نگاری کے دل چسپ نمونے مثنوی 'گلزارِ نسیم' میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں جو اس مثنوی کی

پنڈت دیا شنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)

نمایاں خوبی ہے۔

جزئیات نگاری:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک خصوصیت جزئیات نگاری بھی ہے۔ حالاں کہ نسیم نے ایجاز و اختصار سے کام لینے کی وجہ سے بہت سی جزئیات کو حذف کر دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے موقع و محل کے اعتبار سے مختلف واقعات کو جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں بلاغت کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ جب چاروں شہزادے گل بکاؤلی لے کر آئے تو اس کی مدد سے زین الملوک کی آنکھوں میں دوبارہ روشنی واپس آ گئی۔ اس وقت بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے جشن آراستہ کیا۔ دیکھیے اس واقعے کو نسیم نے جزئیات کی مدد سے درج ذیل اشعار میں کس دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

گل لائے جو نور دیدہ دل خواہ   آنکھوں کی طرح پھڑک گیا شاہ
پنجے سے پلک کے پھول اٹھایا   اندھے نے گل آنکھوں سے لگایا
نور آ گیا چشم آرزو میں   آیا پھر آب رفتہ جو میں

مثنوی 'گلزارِ نسیم' میں اور جگہوں پر بھی جزئیات نگاری کے نمونے موجود ہیں جو اس مثنوی کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

مافوق الفطری عناصر:

قدیم دور کی مثنویوں کا ایک نمایاں عنصر مافوق الفطری عناصر کا بیان ہے۔ یہ عناصر ان مثنویوں میں خاص طور سے داخل ہو جاتے ہیں جن کے پلاٹ فرضی ہوتے ہیں کیوں کہ وہ تاریخی واقعات کے پابند نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ عناصر 'سحر البیان' اور 'گلزار نسیم' دونوں میں موجود ہیں مگر 'گلزارِ نسیم' میں یہ عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی اس مثنوی کا ایک وصف ہے۔

ڈرامائی عناصر:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک اہم خوبی اس میں ڈرامائی عناصر کی موجودگی ہے۔ اس مثنوی میں جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں، اس سے مثنوی میں ڈرامہ نگاری کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ جب روح افزا رہا ہو کر آئی تو جمیلہ اور بکاؤلی اس سے ملنے گئیں اور اس کا حال پوچھا۔ اس موقع پر ان کا مکالماتی انداز ملاحظہ ہو:

روح افزا سے ہوئیں بغل گیر   صورت پوچھی کہا کہ تقدیر

تاج الملوک دلبر بیسوا سے رخصت ہو رہا ہے۔ اس موقع کی تصویر نسیم نے مکالموں کے ذریعے یوں کھینچی ہے:

یہ کہہ کے اٹھا کہا کہ لو جان   جاتے ہیں کہا خدا نگہ بان

غرض یہ کہ اس مثنوی میں جا بہ جا ڈرامائی عناصر موجود ہیں جس سے مثنوی کے فنی حسن میں نکھار اور بلا کی دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا اسلوب:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' جس لکھنوی معاشرے میں لکھی گئی، وہ تکلف و تصنع اور رنگینی و مرصع کاری کا دل دادہ تھا۔ اپنے زمانے اور معاشرے کے مذاق کی مناسبت سے نسیم نے اپنی اس مثنوی میں رنگین اور مرصع اسلوب کو اپنایا۔ ان کے مرصع اسلوب کو اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نسیم خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے اور خود آتش کے نزدیک شاعری 'بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں' یعنی مرصع سازی کا نام تھا۔ چنانچہ پنڈت دیا شنکر نسیم نے بھی بندشِ الفاظ کے معاملے میں اپنے استاد جیسی فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ دیا شنکر نسیم کی اس مثنوی میں مرصع سازی کے نمونے جگہ جگہ بکھرے دکھائی دیتے ہیں اور مرصع کاری میں یہ مثنوی اپنی مثال آپ نظر آتی ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' لکھنوی طرزِ فکر، طرزِ گفتار کی آئینہ دار اور لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں زبان کی سادگی کے بجائے رنگینی ہے اور یہی رنگین اسلوب اس مثنوی کی امتیازی خصوصیت اور اس کی انفرادیت ہے۔ اپنے اسی رنگین اسلوب کی ندرت سے نسیم نے مثنوی کی داستان کو زندہ کر دیا ہے۔ لکھنوی معاشرت اور تہذیب و تمدن کی مرقع کشی میں اس رنگین اسلوب نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

رعایت لفظی:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک نمایاں خصوصیت رعایت لفظی ہے۔ رعایت لفظی مشکل صنعت ہے۔ اس کا برتنا آسان نہیں لیکن نسیم نے اپنی اس مثنوی میں اس صنعت کو نہایت خوبی سے برتا ہے اور لفظی مناسبات کا استعمال اس فنی مہارت سے کیا ہے کہ مثنوی میں ادبی چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اشعار دیکھیے:

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی　　پُر آب وہ چشم حوض پائی

پیراہن گل کی بو تھی مطلوب　　یوسف نے کہا وہ حال یعقوب

تشبیہ واستعارہ:

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں تشبیہات واستعارات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ مثنوی کے پہلے شعر سے لے کر آخری شعر تک تواتر کے ساتھ یہ انداز بیان برقرار رہتا ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے نسیم کے اشعار میں علاحدہ وجود نہیں معلوم ہوتے بلکہ کلام کا جزو بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار دیکھیے:

یوں سیج پہ آکے سوئی بے تاب — جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب
جاگی مرغِ سحر کے گل سے — اٹھی نکہتِ سی فرشِ گل سے

مختصر یہ کہ پلاٹ کی پے چیدگی، اختصار، رعایت لفظی، انتخابِ الفاظ، تشبیہات و استعارات کا حسین استعمال اور رنگین اسلوب اس مثنوی کی فنی خصوصیات و امتیازات ہیں جو اسے دوسری مثنویوں سے منفرد و ممتاز بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مثنوی میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، معاشرت کی تصویر کشی، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور ڈرامائی عناصر کے دل کش نمونے موجود ہیں جو اس کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس مثنوی کا ایک وصف اس میں مافوق الفطری عناصر کا پایا جانا بھی ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' اپنی ان ہی خوبیوں کی بنا پر اُردو کی بے حد اہم مثنوی قرار پاتی ہے اور پنڈت دیاشنکر نسیم ایک بلند پایہ اور ممتاز مثنوی نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ نسیم نے اپنی اس مثنوی کے ذریعے اُردو کے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جس کے ذکر کے بغیر اُردو مثنوی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

17.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(گلزارِ نسیم: آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں: منتخب اشعار)

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گل چیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچہ صبح کھل کھلایا
وہ سبزہ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل! — جھنجلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون! — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل؟ — سوسن! تو بتا کدھر گیا گل؟
سنبل! مرا تازیانہ لانا — شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں: کیا ہوا خدایا!
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون!

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو، داغ ہوجائے
جس گھر میں ہو، گل چراغ ہوجائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس!
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا! نہ لیتی تھی میں
اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل!

او باد صبا! ہوا نہ بتلا
خوش بو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا

بلبل! تو چہک، اگر خبر ہے
گل! تو ہی مہک، بتا کدھر ہے؟

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو بر اندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بہ خود، اس کی سن کے فریاد

جو نخل تھا، سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا، ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی ہو ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دست آویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی
انسان کی دست برد جانی

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات!
خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا
وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا!

عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے
کھال اس کی جو کھینچے، سزا ہے

یہ کہہ کے، جنون میں غضب ناک
خوں روئی، لباس کو کیا چاک

گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بس کہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی، ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اڑ کے جاتی
گل چیں کا کہیں پتا لگاتی

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثل باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے!
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے!

عزیز طلبا! ابھی آپ نے پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

پنڈت دیاشنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)

پہلے شعر میں گل اور بلبل کے استعارے کے ذریعے بکاؤلی کی فرقت کو بیان کیا گیا ہے۔ تاج الملوک سے بچھڑنے کے بعد بکاؤلی کا غم والم آفاق کی وسعتوں تک پھیل گیا ہے۔ چمن چمن اس کی درد بھری آواز محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بلبل چہکتی ہے اور اپنی کوک سے درد والم کا ایک منظر پیش کرتی ہے بالکل اسی طرح بکاؤلی بھی اپنا غم بیان کرتی ہے۔ ایسا غم جس میں فراق ہے، سوز ہے اور بے انتہا تڑپ بھی پوشیدہ ہے۔ دوسرے سے لے کر پانچویں شعر تک میں تاج الملوک کے پھول چرا لینے کے بعد کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ پھول غائب ہو چکا ہے اور بکاؤلی اس سے بے خبر ہے۔ روزمرہ کی طرح وہ صبح کو بے دار ہوتی ہے۔ صبح کے وقت جب غنچے کھلے ہوئے ہیں، روشنی ہوگئی ہے تو بکاؤلی اپنی خواب گاہ سے باہر آئی اور حوض کے پاس پہنچی۔ ابھی نیم خوابی کی کیفیت میں وہ آنکھوں کو مل رہی ہے یعنی پوری طرح بے داری کی کیفیت نہیں آئی ہے۔ چھٹے سے لے کر آٹھویں شعر تک میں اس بات کا بیان ہے کہ بکاؤلی کی نظر جب حوض پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ پھول غائب ہے۔ دوسرے گل تو کھلے ہوئے ہیں لیکن وہ گل جو خاص ہے اور منظور نظر ہے، وہی غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس کی نیند پوری طرح غائب ہوگئی۔ گھبراہٹ میں وہ پھول ڈھونڈنے لگی اور جھنجھلا کر کہا کہ یہ دھوکا کس نے دیا؟ میرا پھول کون لے کر گیا؟ نویں سے لے کر گیارہویں شعر تک میں پھول کے غائب ہونے پر بکاؤلی کے غصے کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ پھول کے غائب ہونے پر بکاؤلی پوری طرح بپھر گئی۔ اس نے اپنے خدمت گاروں سے کہا کہ اگر اس پر کسی نے ہاتھ صاف نہیں کیا ہے تو کیا وہ خوش بو بن کے اڑ گیا ہے۔ پھول اس طرح ہوا نہیں ہوسکتا ہے۔ ضرور کسی نے اسے چُرا لیا ہے۔ بکاؤلی نے پریشان ہو کر سبھی سے تفتیش کی لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ بارہویں سے لے کر پندرہویں شعر تک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بکاؤلی کی سبھی خواصیں جو اس کے ساتھ تھیں، گھبرا کر پہلو چرانے لگیں۔ تھرانے کو بید سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بید ایک قسم کی لچک دار لکڑی ہے۔ اس کی لچک کو تھراہٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نرگس، سوسن اور سنبل سبھی پریشان ہوئے۔ اپنوں میں سے کسی کے پھول چرانے کا اسے گمان بھی نہیں ہے۔ باغ میں سبزے کے سوا کوئی بے گانہ نہیں ہے جس پر اس کو چوری کا شک ہو۔ سولہویں سے لے کر اٹھارہویں شعر تک میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ جب گل کی کوئی خبر نہ ملی تو آخر کار اس نے بددعائیں دینی شروع کیں کہ جس نے بھی وہ پھول چرایا ہے، جس ہاتھ میں بھی وہ پھول ہو، خدا کرے وہ داغ والا ہو جائے۔ بکاؤلی نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا کہ غفلت کی وجہ سے ایسا نایاب اور قیمتی پھول ہم سے چوری ہو گیا۔ انیسویں سے لے کر اکیسویں شعر تک میں گل بکاؤلی کی بے چینی کا تذکرہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ پھول مجھے بہت عزیز تھا۔ حوض کی آنکھ کا تارا تو دراصل وہی پھول تھا۔ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے بکاؤلی کہتی ہے کہ میں اس کا نام زبان پر نہیں آنے دیتی تھی تاکہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو اور نہ ہی کوئی اس کی خصوصیات سے واقف ہو سکے۔ پھول چُرانے والے نے جب گل کو توڑا تو ہائے افسوس کہ غنچے نے بھی کوئی شور نہ کیا اور خاموش رہا جس کی وجہ سے کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہوئی۔

بائیسویں سے لے کر چوبیسویں شعر تک میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ بکاؤلی پھول کی جدائی میں بے حال

ہورہی ہے۔ ہر کسی سے منتیں کررہی ہے۔ کانٹوں کو کوس رہی ہے کہ تو نے گل چیں کو زخمی کیوں نہیں کیا۔ سنبل تو نے بھی خبر نہیں لی۔ بالآخر بادِ صبا کو وہ مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اے صبا! اس کی خوش بو کہیں سے لے آ کیوں کہ ابھی ہوا سے زیادہ اس کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ بلبل اگر تجھے گل کی کوئی خبر ہے تو چہک کر بتا اور پھر غائب ہونے والے پھول کو مخاطب کرکے کہتی ہے کہ اے گل! تو جہاں بھی ہے، مہک کر اپنا راز فاش کردے۔ پچیسویں سے لے کر اٹھائیسویں شعر تک میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ پھول چوری ہونے کے بعد ہر جگہ کہرام مچا ہوا ہے۔ سبزے، سبھی قسم کے پھول، نخل اور برگ و باد، سبھی دم بہ خود ہیں کہ آخر کیا ہوگیا ہے۔ اب پھول کو دوبارہ پالینے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ انتیسویں سے لے کر اکتیسویں شعر تک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھول چوری کرنے کے بعد تاج الملوک نے اپنی انگوٹھی سے بکاؤلی کی انگوٹھی بدل لی تھی۔ بکاؤلی نے جب انگوٹھی پر نظر ڈالی تو وہ ہاتھ میں ڈھیلی نظر آئی۔ اس انگوٹھی کے بدلے جانے کی وجہ سے اسے معلوم ہوا کہ کسی نے اسے خواب گاہ میں بے پردہ دیکھ لیا ہے۔ یہ انگوٹھی اسی بات کی نشانی ہے لیکن اس سے اس چور کا سراغ تو نہیں لگایا جاسکتا۔ کف افسوس ملتے ہوئے بکاؤلی نے کہا کہ ایک جانب تو پھول چوری ہوا ہی، وہ بد ذات انگوٹھی بھی بدل گیا۔ بتیسویں سے لے کر پینتیسویں شعر تک میں بکاؤلی کی غضب ناک کیفیت کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ وہ غضب ناک ہوکر کہتی ہے کہ جس نے بھی مجھے ہاتھ لگایا ہے، اگر وہ میرے ہاتھ لگ گیا تو اس کی کھال کھنچوا دوں گی۔ یہ مجھے عریاں (بے پردہ) دیکھنے کی سزا ہوگی۔ جنون کے عالم میں وہ خون کے آنسو روئی، اس نے اپنا لباس چاک کرڈالا اور دامن کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جس سے اس کے غصے کا اظہار ہوتا ہے۔ چھتیسویں سے لے کر اکتالیسویں شعر تک میں بھی بکاؤلی کی بے چینی کی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ بکاؤلی سمن پری سے کہتی ہے کہ جب میرا پھول میرے پاس نہیں ہے تو مجھے اب چین کہاں مل پائے گا۔ اسی غضب ناک کیفیت میں وہ اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ اس نے گل چیں کا پتہ لگانے کا حکم دیا۔ سمن پری نے باغ باغ گھوم کے تفتیش کی لیکن اس کی بو کہیں نہ ملی۔ ابھی منزل مقصود بکاؤلی کی قسمت میں نہیں تھی۔ حکمِ خداوندی کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ ابھی بکاؤلی کا تاج الملوک سے ملنا طے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ گل کا پتہ چلا اور نہ ہی گل چیں یعنی پھول توڑ کر لے جانے والے کا۔

17.3.4 ماحصل

پنڈت دیا شنکر نسیم کا اصل نام پنڈت دیا شنکر کول اور تخلص نسیم تھا۔ والد بزرگوار کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔ نسیم کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے زمانے کے رواج کے مطابق اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد شاہی فوج میں بہ حیثیت کلرک ان کا تقرر ہوا۔ نسیم نے کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا اور بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصہ مذاق پیدا کرلیا تھا۔ انھوں نے شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش جیسے بلند پایہ شاعر کی شاگردی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و بیان کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں

سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اُردو روزمرہ اور محاورات پر انھیں عبور حاصل ہوگیا۔ پنڈت دیاشنکر نسیم کو شروع میں غزل گوئی کا شوق تھا لیکن بہت جلد جدت طبع نے انھیں مثنوی کی طرف مائل کیا۔ پنڈت دیاشنکر نسیم نے محض ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔ پنڈت دیاشنکر نسیم نے حمد، نعت، غزل، مخمس، ترجیع بند اور واسوخت، غرض مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُردو شعروادب میں ان کو ممتاز مثنوی نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کی مثنوی 'گلزارِنسیم' کو میرحسن کی مثنوی 'سحرالبیان' کے بعد بے پناہ شہرت ومقبولیت ملی۔ ان کی دوسری مشہور تصنیف 'دیوان نسیم' ہے۔ جس میں ان کی تقریباً مکمل و نامکمل ۴۸ غزلیں، پانچ مخمس، دو ترجیع بند، ایک واسوخت، تین خمسے (فارسی) اور چند متفرقات شامل ہیں۔ مثنوی 'گلزارِنسیم' پنڈت دیاشنکر نسیم کی وہ شاہ کار تصنیف ہے جس نے ان کو حیات جاوید عطا کی۔ اس مثنوی کو دبستان لکھنؤ کی شاعری کی پہلی طویل نظم ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ مثنوی 'گلزارِنسیم' کا قصہ اگرچہ طبع زاد نہیں ہے لیکن نسیم نے قصے کو نظم کرتے وقت اس میں بے شمار تبدیلیاں کی ہیں جس کی وجہ سے یہ قصہ ان کا اپنا قصہ بن گیا ہے اور یہ تبدیلیاں اکثر جگہوں پر ایسی ہیں جن سے 'گلزارِنسیم' کی فضا بڑی حد تک مانوس ہوگئی ہے۔ مثنوی 'گلزارِنسیم' کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں قصے کی فضا کو مجموعی اعتبار سے انسانی فضا سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی کرداروں کے افعال واعمال اور جذبات واحساسات حقیقی زندگی کے کرداروں کے جذبات واحساسات معلوم ہوتے ہیں۔ نسیم نے اپنی اس مثنوی میں لکھنوی طرز معاشرت کی ایسی دل چسپ مصوری کی ہے کہ یہ مثنوی لکھنوی تہذیب وتمدن کی ترجمان نظر آتی ہے۔ نسیم نے اس مثنوی میں تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی بہت خوب صورتی سے کیا ہے۔ غرض یہ کہ پنڈت دیاشنکر نسیم کی یہ تصنیف الفاظ کی شوکت، بندش کی چُستی، اسلوب کی ندرت، تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کے باکمال اور فن کارانہ استعمال، معنی آفرینی، نازک خیالی، ایجاز واختصار اور دیگر فنی خصوصیات کی وجہ سے ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- پنڈت دیاشنکر نسیم کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی نگاری سے بحث کی۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِنسیم' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِنسیم' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

17.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہار خیال کیجیے۔

۲۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصانیف سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

۳۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے ماخذ سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۴۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی خصوصیات وامتیازات اور اس کی فنی انفرادیت سے بحث کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا!
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچے، سزا ہے
یہ کہہ کے جنون میں غضب ناک — خوں روئی، لباس کو کیا چاک

17.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کا اصل نام پنڈت دیا شنکر کول اور تخلص نسیم تھا۔ والد بزرگوار کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔ نسیم کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے زمانے کے رواج کے مطابق اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد شاہی فوج میں بہ حیثیت کلرک ان کا تقرر ہوا۔ نسیم نے کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور بیس برس کی عمر میں شعر وسخن کا اچھا خاصہ مذاق پیدا کر لیا تھا۔ انھوں نے شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش جیسے بلند پایہ شاعر کی شاگردی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و بیان کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اُردو روزمرہ اور محاورات پر انھیں عبور حاصل ہوگیا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کو شروع میں غزل گوئی کا شوق تھا لیکن بہت جلد جدت طبع نے انھیں مثنوی کی طرف مائل کیا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے محض ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

۲۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصانیف میں ان کی مشہور مثنوی 'گلزارِ نسیم' اور ان کی دوسری مشہور تصنیف 'دیوان نسیم' کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کو نسیم نے اٹھائیس برس کی عمر میں لکھا تھا لیکن اس کی اشاعت لکھنؤ کے مطبع حسنی میر حسن رضوی سے ۱۸۴۴ء میں عمل میں آئی، تب نسیم کی عمر ۳۳ برس کی تھی۔ نسیم کی اس مثنوی کو میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کے بعد بے پناہ شہرت ومقبولیت ملی۔ نسیم کی دوسری تصنیف 'دیوان نسیم' میں ان کی تقریباً مکمل ونامکمل ۴۸ غزلیں، پانچ مخمس، دو ترجیع بند، ایک واسوخت، تین خمسے (فارسی) اور چند متفرقات شامل ہیں۔

۳۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا اصل قصہ فارسی زبان میں ہے جس کو عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں نہال چند لاہوری نے اس فارسی قصے کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا جس کو دیا شنکر نسیم لکھنوی نے 'گلزارِ نسیم' کے عنوان سے مثنوی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ تاج الملوک اور

بکاؤلی کی عشقیہ کہانی پر مبنی ایک عشقیہ مثنوی ہے جو قصۂ گل بکاؤلی کے نام سے بھی معروف ہے۔

۴۔ پلاٹ کی پے چیدگی، اختصار، رعایت لفظی، انتخابِ الفاظ، تشبیہات و استعارات کا حسین استعمال اور رنگین اسلوب اس مثنوی کی فنی خصوصیات و امتیازات ہیں جو اسے دوسری مثنویوں سے منفرد و ممتاز بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مثنوی میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، معاشرت کی تصویر کشی، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور ڈرامائی عناصر کے دل کش نمونے موجود ہیں جو اس کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس مثنوی کا ایک وصف اس میں مافوق الفطری عناصر کا پایا جانا بھی ہے۔ غرض یہ کہ پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' الفاظ کی شوکت، بندش کی چُستی، اسلوب کی ندرت، تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کے باکمال اور فن کارانہ استعمال، معنی آفرینی، نازک خیالی، ایجاز و اختصار اور دیگر فنی خصوصیات کی وجہ سے ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' اپنی ان ہی خوبیوں کی بنا پر اُردو کی بے حد اہم مثنوی قرار پاتی ہے اور پنڈت دیاشنکر نسیم ایک بلند پایہ اور ممتاز مثنوی نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ نسیم نے اپنی اس مثنوی کے ذریعے اُردو کے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جس کے ذکر کے بغیر اُردو مثنوی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

۵۔ ان اشعار میں بکاؤلی کی غضبناک کیفیت کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ وہ غضب ناک ہو کر کہتی ہے کہ جس نے بھی مجھے ہاتھ لگایا ہے، اگر وہ میرے ہاتھ لگ گیا تو اس کی کھال کھنچوا دوں گی۔ یہ مجھے عریاں (بے پردہ) دیکھنے کی سزا ہوگی۔ جنون کے عالم میں وہ خون کے آنسو روئی، اس نے اپنا لباس چاک کر ڈالا اور دامن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس سے اس کے غصے کا اظہار ہوتا ہے۔

17.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
معاشرت	:	طرزِ زندگی، رہن سہن
جدت طبع	:	مزاج میں نیا پن یا انوکھا پن
اساطیر	:	اسطور کی جمع، روایتیں، داستانیں، مافوق الفطری واقعات
سرگذشت	:	گزرا ہوا، بیتا ہوا واقعہ، حالاتِ زندگی، آپ بیتی
طلسماتی	:	جادوئی، پُراسرار، حیرت انگیز
رعایت لفظی	:	لفظی مناسبت، اشعار میں الفاظ کی ایسی ترتیب جس میں سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی فطری راہ ترک کر کے بات کہنے والا انھیں تکلف اور تصنع کے رشتے میں جوڑتا ہے
صنائع وبدائع	:	شعر میں حسن اور زور پیدا کرنے کے لیے زبان و بیان کے وسائل مثلاً تشبیہ و استعارہ
رقیب	:	معشوق کے عاشق کا مخالف، دشمن

دانستہ	:	قصداً، جان بوجھ کر
محاسن	:	خوبیاں، اچھائیاں
عُریاں	:	برہنہ، بے لباس، بے پردہ
ساخت	:	بناوٹ، ہیئت
حیات جاوید	:	ہمیشہ کی زندگی
تجویز	:	رائے دینا، قرارداد
مرصع سازی	:	سجانا سنوارنا، نگینے جڑنا
عبور	:	کسی علم یا فن پر مہارت
عنقا	:	ایک فرضی افسانوی پرندہ، ناپید، معدوم
آب وتاب	:	حسن وخوبی، چمک دمک
حریف	:	مخالف
یدطولی	:	لمبا ہاتھ، مراد کسی خاص کام میں کافی مہارت
دہقان	:	دیہات یا گاؤں کا باشندہ، کسان
بلاغت	:	خوش بیانی، تیز بیانی، فصاحت
مافوق الفطرت	:	جو فطری قوتوں سے بالاتر قوتوں کا نتیجہ ہو
رُوح افزا	:	تازگی یا فرحت بخشنے والا

17.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ مثنوی گلزارِ نسیم (تصحیح و ترتیب) : رشید حسن خاں

۲۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : ڈاکٹر گیان چند جین

۳۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

۴۔ اُردو کی تین مثنویاں : پروفیسر خان رشید

۵۔ اُردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) : سید محمد عقیل رضوی

اکائی نمبر 18 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہر عشق: معشوق کی رخصتی)

ساخت

18.1 اغراض و مقاصد

18.2 تمہید

18.3 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

18.3.1 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کے سوانحی احوال و کوائف

18.3.2 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کے ادبی کارنامے

18.3.3 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری

18.3.4 متن کی تدریس و تفہیم

18.3.5 ماحصل

18.4 آپ نے کیا سیکھا؟

18.5 اپنا امتحان خود لیجیے

18.6 سوالوں کے جوابات

18.7 فرہنگ

18.8 کتب برائے مطالعہ

18.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کے سوانحی احوال و کوائف اور ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے۔
- مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے۔
- مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

18.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار ملا وجہی، نصرتی، ابن نشاطی، میر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات اور فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے اہم مثنوی نگار نواب مرزا

تصدق حسین شوق لکھنوی کے سوانحی احوال وکوائف اوران کے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے اس کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اوراس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

18.3 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس وتفہیم

18.3.1 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کے سوانحی احوال وکوائف

نواب مرزا شوق لکھنوی کا اصل نام تصدق حسین خان اور تخلص شوق لکھنوی تھا۔ وہ حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی پیدائش ۶ رجنوری ۱۷۷۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل ہوئی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور اساتذہ کے فیضِ صحبت سے انھوں نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کا خاندانی پیشہ حکمت و طبابت تھا۔ ان کے بزرگ اودھ کے شاہی درباروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے والد آغا علی خان مشہور حکیم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب مرزا شوق بھی تعلیم کے بعد اپنے اسی خاندانی پیشے سے وابستہ ہوگئے اور شاہی طبیب کے اہم عہدے پر بھی فائز ہوئے۔

نواب مرزا شوق کی مثنوی 'فریبِ عشق' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ نواب مرزا شوق بچپن سے ہی ذہین، نازک مزاج، عیش پسند، نفاست پسند اور حُسن کے دل دادہ تھے۔ وہ بچپن میں اسی کے ساتھ کھیلتے تھے جو حسین ہوتا تھا۔ وہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی چہل پہل اور رونق کے مراکز یعنی نوچندی، 'کربلا'، 'حسین آباد کا امام باڑہ اور درگاہ وغیرہ میں پابندی سے جایا کرتے تھے۔ کوئی میلا ٹھیلا یا تہوار ایسا نہیں تھا جس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شریک نہ ہوتے ہوں۔ احباب کی صحبت میں شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ دل لگی کے ساتھ سیر وشکار سے بھی جی بہلایا کرتے تھے۔ وہ عاشقی کے فن میں خاصے ماہر ہوگئے تھے اور تماش بینوں کے مرشد کہلاتے تھے۔ عشق بازی کی وجہ سے وہ ایسے مشہور ہوگئے تھے کہ جب 'فریبِ عشق' کی ہیروئن سے انھوں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے قہقہہ مار کر کہا۔ ارے تو ہی نواب مرزا ہے:

سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف   ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف

نواب مرزا شوق لکھنوی واجد علی شاہ کے زمانے کے شاعر ہیں۔ اس عہد میں لکھنؤ علم وہنر کا گہوارہ بن چکا تھا، ہر طرف اندر سبھائیں ہورہی تھیں، سوانگ رچائے جارہے تھے، خود جان عالم ان تقریبات میں پیش پیش تھے، پورا معاشرہ سرور ومستی اور عیش ونشاط میں ڈوبا ہوا تھا، کیا عوام اور کیا خواص، سب پر 'کسبی کلچر' کا رنگ چھایا ہوا تھا،

مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہر عشق: معشوق کی رخصتی)

مردوں کا کوٹھوں پر جانے کا رواج وبا کی شکل اختیار کر گیا تھا، معاشرے میں کسبیوں، ڈیرہ دارنیوں اور طوائفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، بیگمات کہنے کو پردہ نشین تھیں لیکن ان کے عادات واطوار پر بازاری عورتوں اور کسبیوں کا جادو چل رہا تھا، طوائفیں کوٹھوں سے اٹھ اٹھ کر محلوں میں داخل ہو رہی تھیں، خود واجد علی شاہ کی زیادہ تر معشوقاؤں کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔

مرزا شوق جب شعور کی منزل کو پہنچے تو اس وقت ہر طرف شاعری کا چرچا تھا۔ معاشرے میں شعرا کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مرزا شوق کو اسی ماحول سے شعر گوئی کی تحریک ملی۔ حالاں کہ شاعری ان کے لیے تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی تاہم انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور ان سے فن کی باریکیاں سیکھیں۔ آتش نے مرزا شوق کو صرف فن کے اسرار ورموز ہی نہیں سکھائے بلکہ ان کی معیت میں مرزا کے مزاج کی رنگینی میں مزید نکھار آیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں۔ بعد میں وہ طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے پھر مثنوی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مرزا شوق واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دربار سے بہ طور وظیفہ پانچ سو روپے ملتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں ۱۸۷۱ء میں وہ سپردِ خاک ہوئے۔ ان کی وفات کے تعلق سے تذکرۂ شوق کے مصنف عطاء اللہ پالوی نے لکھا ہے:

> ''نواب مرزا شوق نے ۱۲/ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۳۰/ جون ۱۸۷۱ء بروز جمعہ لکھنؤ میں بہ عمر ۹۱ سال انتقال کیا اور اس قبرستان میں جو اس وقت ریلوے لائن کے بالکل نیچے اسٹیشن کی طرف واقع ہے اور اس 'مخزن الشعرا' میں جس میں ۱۷۸۰ء میں مرزا رفیع سودا، ۱۷۸۶ء میں میر غلام حسن، ۱۸۱۰ء میں میر تقی میر، ۱۸۱۷ء میں انشاء اللہ خاں انشا، ۱۸۲۴ء میں غلام ہمدانی مصحفی، ۱۸۳۰ء میں امام بخش ناسخ اور ۱۸۴۶ء خواجہ حیدر علی آتش کے سے باکمال افراد سپردِ خاک ہوئے تھے، ۱۸۷۱ء میں شوق بھی دفنا دیے گئے۔''
>
> (عطاء اللہ پالوی، تذکرۂ شوق، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص: ۵۵۔۵۶)

18.3.2 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کے ادبی کارنامے

مرزا شوق لکھنوی آتش کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں۔ بعد میں وہ طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے، پھر مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے تین مثنویاں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' لکھی ہیں۔ ان سے کچھ اور مثنویاں بھی منسوب ہیں جیسے 'لذتِ عشق' اور 'خنجرِ عشق' لیکن یہ مثنویاں دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی دستیاب مثنویاں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' ہیں۔ 'فریبِ عشق' مرزا شوق لکھنوی کی پہلی مثنوی ہے جو ۱۸۴۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مثنوی ۴۲۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی پر اظہارِ

خیال کرتے ہوئے عطاء اللہ پالوی نے لکھا ہے:

> ''اس مثنوی کے ذریعے اہلِ لکھنؤ کو علی الاعلان اس سے آگاہ کیا گیا کہ اس وقت کربلا، درگاہ اور وہ سارے مقامات مقدسہ جہاں جہاں مذہبی آڑ لے کر اجتماعِ مرد و زن ہوتا ہے، وہ شبستانِ عیش و آوارگی کا اڈہ بنے ہوئے ہیں اور ہماری عورتیں وہاں ہرگز تزکیۂ نفس کے لیے نہیں بلکہ تسکینِ نفس کے لیے جایا کرتی ہیں۔''

(عطاء اللہ پالوی، تذکرۂ شوقؔ، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص: ۷۶)

'بہارِ عشق' مرزا شوقؔ کی دوسری مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۴۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں ۱۸۴۲ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی بھی اپنے عہد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے شوقؔ کی اس مثنوی کو زبان و بیان کے اعتبار سے سب سے بہتر مثنوی قرار دیا ہے۔

'زہرِ عشق' نواب مرزا شوقؔ کی تیسری اور آخری مثنوی ہے۔ شاہ عبداللہ نے اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۲ء کے دوران کے زمانے کو بتایا ہے جب کہ نظامی بدایونی نے ۱۸۶۱ء کو اس کا سن تصنیف قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے کوئی حتمی سن تصنیف نہیں بتایا ہے لیکن مختلف شہادتوں کی بنیاد پر انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ مثنوی ۱۸۶۱ء کے آس پاس کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہوگی۔ 'زہرِ عشق' ۴۵۵ اشعار پر مشتمل ایک حُزنیہ مثنوی ہے۔ مرزا شوقؔ نے تین مثنویاں ضرور لکھی ہیں لیکن جس مثنوی سے ان کو شہرت و مقبولیت ملی، وہ 'زہرِ عشق' ہے۔ یہ مثنوی اُردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مرزا شوقؔ نے لکھنؤ کے روزمرہ و بامحاورہ اور وہاں کی بیگماتی زبان کو بڑی خوبی سے برت کر متعلقہ عہد کی تہذیبی زندگی کے نقوش محفوظ کر دیے ہیں۔ بعض محققین نے 'زہرِ عشق' کا موازنہ جرمن ادیب گوئٹے کے The Sorrow of young werther سے بھی کیا ہے۔ ان دونوں تخلیقات میں مختلف واقعات کی ترتیب و تنظیم اور موضوعات کی سطح میں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں مقامات پر زندگی یکساں نظر آتی ہے اور دونوں تخلیقات میں انجام ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔ مثنوی 'زہرِ عشق' کی ہیروئن مہ جبین عشق میں رسوائی کے خوف سے خودکشی کر لیتی ہے۔ اسی طرح گوئٹے کی تخلیق میں ایک نوجوان عشق میں ناکامی کے بعد خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مرزا شوقؔ نے مثنوی کے علاوہ غزلیں اور واسوخت بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کی غزلیں روایتی انداز کی ہیں جن میں عشق و عاشقی کے موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ انھوں نے اکتالیس بندوں پر مشتمل ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو فدا علی عیشؔ کے مرتب کردہ 'مجموعۂ واسوخت' میں شامل ہے۔ ان کا واسوخت مسدس کی ہیئت میں ہے جس

میں روایت کی پاس داری نظر آتی ہے۔ بلاشبہ نواب مرزا شوق نے مثنوی کے علاوہ غزل اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن انھیں شہرت و مقبولیت اپنی مثنویوں کی وجہ سے حاصل ہوئی جنھیں انھوں نے اپنی فنی ہنر مندی سے پایۂ کمال کو پہنچایا۔ مرزا شوق کی یہ مثنویاں اُردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ ہیں جو اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

18.3.3 مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری

شمالی ہند میں اُردو مثنوی نگاری کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں بے ساختہ تین مثنویوں کے نام آتے ہیں یعنی 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم' اور 'زہرِ عشق'۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان تینوں مثنویوں کا تعلق دبستان لکھنؤ سے ہے اور ان تینوں مثنویوں میں لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی جھلکیاں الگ الگ انداز میں ملتی ہیں۔ 'سحر البیان' میں چیزوں کو تفصیل سے بیان کرنے کا رجحان غالب ہے تو 'گلزارِ نسیم' میں اختصار کے ساتھ رعایتوں کے اہتمام پر خاص زور ہے اور 'زہرِ عشق' میں لکھنؤ کے روزمرہ اور محاوراتی زبان کے کام یاب استعمال کے ساتھ انسانی جذبات کی دل چسپ تصویر کشی ہے۔ مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں کے ماخذ کے سلسلے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ بعض ناقدینِ ادب نے مومن کی مثنویات اور میر اثر کی 'خواب وخیال' کو ان کی مثنویوں کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق 'خواب وخیال' میں آپ بیتی کا جو پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے، مثنویاتِ شوق میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ 'خواب وخیال' کو 'زہرِ عشق' کا ماخذ قرار دینے کے پس پردہ ان میں داخلی مماثلت کا پیدا ہونا ایک اہم وجہ ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شوق کی مثنویوں پر واجد علی شاہ کی 'سحرِ الفت' اور میر کی مثنوی 'دریائے عشق' کے اثرات ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مرزا شوق لکھنوی نے ان مثنویوں سے استفادہ کیا ہو لیکن تسلیم کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے تخیل پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ مرزا شوق کی مثنویوں میں اخذ واستفادے کے ساتھ امتیاز وانفرادیت کی جو نوعیت ہے، اس پر ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے دل چسپ تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''شوق کی تینوں مثنویاں اس نومولود بچے کی طرح ہیں جس کے خدوخال اور چہرے مہرے پر غائب اسلاف اور حاضر بزرگوں کے اثرات موجود ہیں اور جنھیں دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناک دادا پر گئی ہے، دہن باپ پر گیا ہے، کتابی چہرہ ماں کا ہے، رخسار نانی پر گئے ہیں اور پیشانی خالہ پر گئی ہے اور جب یہ سب اثرات مل کر بچے کے وجود کا حصہ بنتے ہیں تو وہ ساری مشابہتوں کے باوجود اپنا ایک الگ وجود، ایک اکائی رکھتا ہے اور اپنا ایک الگ جمالیاتی تاثر بھی پیدا کرتا ہے جو اس کا اپنا امتیاز اور اس کی اپنی انفرادیت ہے۔''
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص: ۹۴۰)

مذکورہ اقتباس سے اس بات پہ روشنی پڑتی ہے کہ مرزا شوقؔ نے دوسروں کے شاہ کار کو بھی مدنظر رکھا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیت کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ اس طرح ایک تیسری چیز وجود پذیر ہوئی ہے جو امتیاز وانفراد کا حامل ہے۔ مرزا شوقؔ نے اپنی مثنویوں میں عشق کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ان کی تینوں مثنویوں میں عشق کے الگ الگ پہلو نظر آتے ہیں۔ 'فریبِ عشق' میں ہوس اور تماش بینی ہے۔ مرد ہرجائی ہے اور اپنے مطلب کے حصول کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے میں اسے کوئی عار نہیں ہے۔ مثنوی 'بہارِ عشق' عشق کا ایک نیا زاویہ سامنے لاتی ہے جس میں عاشق اپنی محنت رائیگاں جاتا دیکھ کر شادی کے ذریعے وصل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ مثنوی 'زہرِ عشق' میں عشق کی ایک تیسری جہت ملتی ہے۔ 'زہرِ عشق' کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے پر دل وجان سے عاشق ہیں۔ آگے چل کر رسوائی کے خوف سے ہیروئن خودکشی کر لیتی ہے اور عاشق بھی خودکشی کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'زہرِ عشق' میں عشق کی اس جہت کو اس دور کی سچی کہانی بتایا ہے۔ 'زہرِ عشق' ایک حزنیہ مثنوی ہے جو یاس، حسرت اور غم پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ اس میں لکھنؤ کی سماجی وتہذیبی زندگی کی تمام تفصیلات جمع ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کی مصروفیات کیا تھیں، ان کے ملبوسات کیسے تھے، مرد وزن کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، امیرزادیاں اور بیگمات کس طرح اکیلی ڈولیوں میں سیر کو نکل جاتی تھیں، ان کی زبان اور ان کا محاورہ کیا تھا، ان کی زبان پر کس طرح بازاری عورتوں کے محاورے چڑھے ہوئے تھے، گانے، بجانے، رقص، موسیقی اور شعروسخن کی محفلیں کس طرح معاشرتی زندگی کا لازمہ بن گئی تھیں، اس زمانے میں باغ کس وضع کے ہوتے تھے، ان باغات میں کون کون سے پھول کھلائے جاتے تھے، حقیقی زندگی سے مذہب کا کیا واسطہ تھا وغیرہ، ان کی اس مثنوی میں ان تمام پہلوؤں کی تصویرکشی ملتی ہے۔

مرزا شوقؔ کی مثنوی نگاری پر عریاں نگاری اور فحاشی کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں لیکن انھوں نے لکھنؤ کے جس معاشرے کو اپنی مثنویوں میں پیش کیا ہے، اس میں طوائف کو مرکزیت حاصل تھی۔ ادب میں ریختی اور واسوخت کے چلن کے پس پردہ وہی طوائف تھی جو فکر کے مرکز میں تھی۔ درگاہ، کربلا، حسین آباد کا امام باڑہ اور نوچندی کا میلہ، یہ سب صرف تہذیبی زندگی کی ہلچل اور رونق کے لیے مشہور نہ تھے بلکہ یہ تہذیبی ادارے غلط کاریوں کے بدنام اڈے بھی تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد کے کلچر کو 'کسبی کلچر' سے تعبیر کیا ہے جس سے اس معاشرے میں طوائف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا شوقؔ نے رنگین بیانی سے کام لیا ہے اور بعض مقامات پر بے باکانہ انداز میں معاملاتِ عشق کو پیش کیا ہے لیکن حقیقت میں انھوں نے وہی بیان کیا ہے جو انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا۔ جہاں تک ناگفتنی مناظر اور کیفیات کو مزے لے لے کر بیان کرنے کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کا درج ذیل بیان ملاحظہ کیجیے:

> ''مرزا شوقؔ نے اس مثنوی میں ذکرِ گناہ سے لذت لی اور اس میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے کے لیے مردانہ اور زنانہ محاوروں کو بے باکی اور عریانی

سے استعمال کیا ہے۔''

(ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۹ء، ص:۲۰۱)

مرزا شوقؔ نے اپنی مثنویوں میں لکھنؤ کے محاورۂ نسواں کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ کرداروں کی سرگرمیوں سے اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں بول چال کے عام و خاص لہجے اور روزمرہ کے بعض متروک الفاظ اور محاورے استعمال کر کے شعر و ادب کے رُخ کو بدل دیا اور اُردو شاعری کو ایک نئی سمت دی۔ ان کی مثنوی نگاری کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے:

''میر حسنؔ کے بعد مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔..... ان مثنویوں میں اکثر مقامات اس قدر رام مورل اور خلاف تہذیب ہیں کہ ایک مدت سے ان تمام مثنویوں (صرف ایک مثنوی) کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا ہے لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک ان کو بدر منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جو اب تک متروک ہو گئے ہیں اور حشو و بھرتی کے الفاظ سے پاک ہیں، ان میں ایک قسم کا بیان زبان کی گھلاوٹ، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر کے بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔''

(خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مقدمۂ شعر و شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص:۳۴۶)

عبدالقادر سروری مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان کے قصے دل چسپ ہیں اور ان میں جذبات انسانی کی صورت کشی کی گئی ہے۔ ان قصوں میں فوق الفطرت عناصر نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے افراد زندہ اور چلتے پھرتے انسانوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔...... مکالمے شوقؔ کی مثنویوں کے بہترین اجزا ہیں۔ ان میں روزمرہ اور محاورہ کا پورا لطف موجود ہے۔ اگر شوقؔ پر اپنے زمانے کے مذاق کا اثر غالب نہ ہوتا تو وہ یقیناً ایک بڑے صناع ثابت ہوتے۔ بحالت موجودہ شوقؔ کی مثنویاں واجد علی شاہ کے زمانے کے تعیش پسند لکھنؤ کے وفا شعار نقشے معلوم ہوتے ہیں۔''

(ڈاکٹر عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص:۱۲۹)

مرزا شوقؔ کی مثنوی نگاری کی ایک خوبی ان کی کردار نگاری ہے۔ ان کی مثنویوں میں گوشت پوست کے انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور یہ کردار اپنی بول چال اور اعمال وافعال سے قصوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ بعض کردار ایسے ہیں جو اپنے منفرد خد وخال کے ساتھ ہمارے حافظے میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔ مثلاً 'زہرِ عشق' کی ہیروئن مہ جبین یا پھر 'بہارِ عشق' کی مہ لقا۔ مہ لقا کے کردار کو پیش کرتے ہوئے مرزا شوقؔ نے ہنرمندی اور صناعی سے کام لیا ہے۔ مہ لقا کی جو تصویر مرزا شوقؔ نے پیش کی ہے، اس میں دل کشی کے ساتھ تکمیلیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ 'زہرِ عشق' کی ہیروئن مہ جبین کے کردار کو بھی پیش کرنے میں مرزا شوقؔ نے کمال کی فنی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مہ جبین خود کو خودکشی کے عمل سے گزار کر عشق میں ثابت قدمی کی ایک اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے اپنے آپ کو بھی اس کے غم میں برابر کے شریک پاتے ہیں۔

مرزا شوقؔ کی مثنوی نگاری کی ایک اہم خوبی ان کی جذبات نگاری بھی ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں بالخصوص 'زہرِ عشق' میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ عشق کے مختلف تجربات اور اس کی متنوع کیفیات کو انھوں نے کام یابی سے برتا ہے۔ عاشق ماہ رو کو دیکھ کر بے تاب ہوجاتا ہے اور وہ اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہے لیکن دیدار کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ اس صورت حال میں عاشق جن تجربات و کیفیات سے گزرتا ہے، انھیں مرزا شوقؔ نے سوز کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

ہوئی میری جو اس سے چار نگاہ — منھ سے بے ساختہ نکل گئی آہ
حال دل کا کہا نہیں جاتا — خوب سنبھلا، نہیں غش آجاتا
نہ ہوا گو کلام فی مابین — رُوح قالب میں ہوگئی بے چین
تیر الفت جو تھا لگا کاری — اشک بے ساختہ ہوگئے جاری
سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر — چپ کھڑا تھا میں صورت تصویر
تاب نظارہ اتنی لا نہ سکا — کہ اشارے سے بھی بُلا نہ سکا

مرزا شوقؔ کی مثنویوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے ہمیں واقعیت (Realism) اور حسیت (Sensuousness) کا احساس ہوتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے ان کی مثنویوں میں واقعیت اور حسیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مثنوی (زہرِ عشق) میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملتی جہاں شوقؔ اثر انگیزی میں ناکام رہے ہوں۔ وہ کوئی ایسی چیز بیان نہیں کرتے جو قدرت کے مسلمات کے خلاف ہو یا فطرت کے اصولوں سے متصادم نظر آتی ہو''۔ مرزا شوقؔ نے رخصتی کے وقت جن جذبات و کیفیات کو پیش کیا ہے، وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہیروئن کی خودکشی کے بعد مرزا شوقؔ نے جس سوگوار ماحول کا نقشہ کھینچا ہے اور عاشق

کے دل کی مختلف کیفیات کو جس انداز میں رقم کیا ہے، وہ واقعیت اور حسیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی مثنویوں میں گوشت پوست کے انسانوں کی جو خوبیاں اور خامیاں بیان کی گئی ہیں، ان میں واقعیت اور حسیت کا واضح رنگ جھلکتا ہے۔ مرزا شوقؔ کی مثنوی نگاری کا ایک مخصوص وصف ان کی زبان ہے۔ ان کی مثنویوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی تخلیق کے پس پردہ محاوراتِ نسواں کا تحفظ ایک اہم جذبے کے طور پر کارفرما ہے۔ شاید اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں لکھنؤ کے روزمرہ اور لکھنؤ کی بیگمات کے محاورات کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔ مثنوی نگاری کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی انوکھی پہل تھی جس میں زبان کو تخلیق کے مرکز میں رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ ان کی مثنویوں میں روزمرہ اور محاورے کے فن کارانہ استعمال کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کی مثنویاں روزمرہ اور محاورے کی چاشنی سے پُر لطف ہوگئی ہیں اور اپنے عہد کی زبان اور اس دور کی تہذیبی و سماجی زندگی کا مظہر بن گئی ہیں۔ ان کی مثنوی 'فریبِ عشق' کی ہیروئن امیر زادی ہے لیکن اس کی زبان اور ایک کسبی کی زبان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

کیا موؤں پر قیامت آئی ہے   مونڈی کاٹوں کی شامت آئی ہے
یہاں لاکر جو مجھ کو ڈالا ہے   دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے

مرزا شوقؔ کی مثنویوں میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے:

> ''شوقؔ کے قصوں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں تنوع نہیں ہے۔ انجام سے قطع نظر، جزئیات میں تمام مثنویاں ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں اور یہی حال کرداروں کا بھی ہے۔ صرف 'زہرِ عشق' کی ہیروئن میں کسی قدر انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ تناسب جو حسن کاری کی جان ہے، ان مثنویوں میں مفقود ہے۔ ہیروئن کی گفتگو کو بے ضرورت طولانی بنا دیا گیا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقا، ص: ۱۳۰)

یہ صحیح ہے کہ مرزا شوقؔ کی مثنویوں میں کچھ نقائص بھی ہیں لیکن ان سے قطع نظر، ان کی مثنویوں میں جو دوسری فنی خوبیاں ہیں، اس کی بنا پر ان کی مثنویاں بہ طور خاص مثنوی 'زہرِ عشق' اُردو ادب میں زندہ رہے گی۔

18.3.4 متن کی تدریس و تفہیم

(زہرِ عشق: معشوق کی رخصتی: منتخب اشعار)

تھا یہی ذکر جو بجا گھڑیال   سنتے ہی اس کے ہوگئی بے حال
ہوگیا فرط غم سے چہرہ زرد   دست و پا تھرتھرا کے ہوگئے سرد
مردنی رخ پہ چھاگئی اس کے   دل میں وحشت سماگئی اس کے

دل میں گزرا جو اس کے صبح کا شک   ہوئی استادہ جا کے زیر فلک
ٹھنڈی جس دم چلی نسیمِ سحر   ہوگیا حال اور بھی ابتر
اتنے میں صبح کی بجی وردی   دونی چہرے کی ہوگئی زردی
ہوئے ثابت جو صبح کے آثار   ہوگئی اور اس کی حالت زار
بید کی طرح جسم تھرایا   سر سے پاؤں تک عرق آیا
باتیں کرنی جو تھیں سو بھول گئی   دل لگا چڑھنے سانس پھول گئی
بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ   اور کہا لَا الہ اِلا اللہ
اب فقط ہے یہ خون بہا میرا   بخش دیجو کہا سنا میرا
کہہ کے پھر وہ لپٹ گئی اک بار   اور کیا بھینچ بھینچ کرکے پیار
سر سے لے کر بلائیں تا بہ قدم   بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت   بام پر آئی تھی میں کون سے وقت
پھر یہ بولی وہ پونچھ کر آنسو   میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تم
آزماتی تھی تجھ کو کستی تھی   میں تیرے چھیڑنے کو ہنستی تھی
کہہ کے یہ بات ہوگئی وہ سوار   یاں بندھا آنسوؤں کا آنکھ سے تار
آتش غم بھڑک گئی دونی   تپش قلب نے کی افزونی
یاد آتی تھی جب وصیت یار   وہم لاتا تھا دل ہزار ہزار
تھی مصیبت جو یہ بلا انگیز   دھیان آتے تھے کیا کیا وحشت خیز
دل میں کہنے کا اس کے تھا جو ملال   آتے تھے ذہن میں عجیب خیال
کون روکے گا جا کے گھر بیٹھے   جو کہا ہے وہی نہ کر بیٹھے
ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں   چپکا روتا تھا بیٹھا میں محزوں
کہ اٹھا ایک سمت سے وہ غل   ہوش جس سے کہ اڑ گئے بالکل
شعلہ اک آگ کا بھڑکنے لگا   مثل بسمل کے دل پھڑکنے لگا
یوں تو گزرے تھے دوپہر روتے   اور ہاتھوں کے اُڑ گئے طوطے
ہوگیا دل کو اس طرح کا ہراس   آئے سو سو طریق کے وسواس
کہا اک دوست سے کہ تم جا کر   جلد اس شور و غل کی لاؤ خبر
روتے ہیں ہم سے بدنصیب کہیں   مرگیا ان کا کیا حبیب کہیں
یوں جو اپنی یہ جان کھوتے ہیں   کون ہیں کس لیے یہ روتے ہیں
کیا ہوا ان پہ صدمۂ جاں کاہ   یہ جو کرتے ہیں ایسے نالہ و آہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

دوڑے آخر اس طرف مرے احباب — لے کے آئے خبر وہاں سے شتاب
کیا اس طرح آکے مجھ سے بیاں — کہ یہاں سے ہے اک قریب مکاں
باغ کے پاس جو بنا ہے گھر — واں فروکش ہے ایک سوداگر
یوں تو اک شور راہ بھر میں ہے — پر یہ آفت انھیں کے گھر میں ہے
صاف کُھلتا نہیں ہے یہ اسرار — مرگیا کوئی یا کہ ہے بیمار
پر یہ ہوتا ہے عقل سے ادراک — کہ نہیں بے سبب اُڑاتے خاک
کچھ نہ کچھ تو ہے ایسی ہی روداد — کہ ہے یہ شور نالہ و فریاد
نہیں برپا یہ بے سبب ماتم — ہے نکلتا کسی جواں کا دم
ہر بشر ہورہا ہے دیوانہ — کوئی مرتا ہے صاحب خانہ
نہیں قابو میں ہے کسی کا دل — پیٹتے سر ہیں صاحبانِ محل
نہیں دیتا سُنائی کچھ بالکل — ہے فقط ایک ہائے ہائے کا غُل
تھمتا اک دم بھی واں خروش نہیں — کس سے پوچھیں کسی کو ہوش نہیں
روتے جس درد سے ہیں وہ اِس دم — دیکھا جاتا نہیں خدا کی قسم
کہہ گئی تھی جو وہ کہ کھاؤں گی زہر — میں یہ سمجھا کہ ہوگیا وہی قہر
گو حیا سے نہ اس کا نام لیا — دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا
دوستوں نے جو دیکھی یہ حالت — بولے اس طرح ازرہ اُلفت
حال دل یوں تمہارا غیر جو ہے — مگر اس وقت کیا ہے خیر تو ہے
بے سبب کس لیے ہوئے ہو اُداس — اُڑ گئے کیوں تمہارے ہوش و حواس
کون سی آفت آگئی اس دم — مُردنی منہ پہ چھاگئی اس دم
کیا ہے اتنے جو بے قرار ہو اب — کوئی مرجائے تم کو کیا مطلب
ایسی حالت جو پیچ و تاب کی ہے — تم کو کیا وجہ اضطراب کی ہے
شہر میں لوگ روز مرتے ہیں — خفقاں اس کا کوئی کرتے ہیں
فکر کرنا ہے اس طرح کی زبوں — یوں ہی ہوجاتا ہے بشر کو جنوں
سُن کے ماں باپ کیا کہیں گے بتاؤ — ہوش پکڑو ذرا حواس میں آؤ
تم کو کیا ہے جو جان کھوتے ہو — بے سبب آپ ہی آپ روتے ہو
ہو رہے ہو ملول کس غم سے — حال دل کا کہو تو کچھ ہم سے
طعنہ آمیز دوستوں کے بیاں — ہوئے معلوم نشترِ رگِ جاں
نہ دیا ان کو مارے غم کے جواب — ڈھانپ کر منھ کیا بہانہ خواب

اٹھ گئے دوست آشنا جس دم | کھول کر منہ اٹھے وہاں سے ہم
حالِ دل سینہ میں ہوا جو تباہ | بیٹھا کمرے میں آن کر سرِ راہ
دیکھا برپا ہے ایک حشر کا غُل | بھیڑ سے راہ بند ہے بالکل
اُس طرف سے جو لوگ آتے ہیں | یہی آپس میں کہتے جاتے ہیں

عزیز طلبا! ابھی آپ نے مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

'زہرِ عشق' ایک مختصر عشقیہ مثنوی ہے جس میں مرزا شوق نے سادگی و سلاست کے ساتھ جذبات نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نعت اور حضرت علیؓ کی شان میں منقبت کے چند اشعار ہیں۔ اصل قصے سے پہلے مرزا شوق نے بتایا ہے کہ عشق کے جذبے سے کوئی بشر خالی نہیں ہے۔ عشق کی وجہ سے انسان طرح طرح کی مشکلات اور رُسوائیوں کا سامنا کرتا ہے اور ہجر و فراق کے کڑوے کسیلے گھونٹ بھی پیتا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ کوئی عشق کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس قصے میں ایک جگہ معشوقہ کی رُخصتی کا منظر ہے۔ مذکورہ اشعار اسی منظر سے متعلق ہیں جن میں معشوقہ کی رُخصتی کا بیان انتہائی سوز کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ رُخصتی ہمیشہ کے لیے ہے، اس لیے مرزا شوق نے یہاں ایسی جزئیات سے کام لیا ہے کہ پورا منظر نگاہوں میں گردش کرنے لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ ہمارے سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ فرطِ غم سے معشوق کے چہرے کا زرد پڑ جانا، ہاتھ پاؤں کا تھرتھرا کر سرد ہو جانا، چہرے پر مُردنی چھا جانا، بید کی طرح جسم کا تھرانا، سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوب جانا، جو باتیں گوش گزار کرنی تھیں، ان کا غیر شعوری طور پر بھول جانا، سانس پھولنے لگنا اور دل چڑھنے لگنا وغیرہ جیسی تفصیلات سے معشوقہ کی بے پناہ محبت بھی آشکار ہوتی ہے اور اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ فراق اور ہمیشہ کی جدائی کا احساس معشوقہ کے لیے روح فرسا ہے۔ ان تفصیلات سے جہاں معشوق کے کردار کی فطری سادگی سامنے آتی ہے، وہیں ہمیں انسانی نفسیات پر مرزا شوق کی گرفت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی ضروری تفصیل نہیں بھولتے اور عشق کی مختلف کیفیات و احساسات کو انتہائی ہنرمندی سے شعری خلعت عطا کرتے ہیں۔ یہ تمام تفصیلات مشرقی اقدار کی ترجمان ہیں۔ رُخصتی کے وقت معشوقہ کا عاشق سے یہ کہنا کہ کہا سنا بخش دینا مشرقی طرزِ معاشرت کی ایک اہم قدر ہے۔ جب ہم اپنے اعزہ و اقارب سے رخصت کی اجازت چاہتے ہیں تو وہاں بھی اپنی خطاؤں کے لیے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ یہاں تو معاملہ عشق کی انتہا کا ہے جس میں عشق کا راز فاش ہو چکا ہے اور ہیروئن کو اس کے گھر والے بنارس بھیجنا چاہتے ہیں۔ گویا یہ ملاقات آخری ملاقات تھی۔ اس موقع پر معشوقہ کا عاشق کی بلائیں لینا، بات بات میں سر کی قسم کھانا یا کھلانا نیز خود کو کوسنا کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ اپنی چھت پر گئی تھی اور عشق کے مرض میں مبتلا ہوئی تھی، جیسی باتوں اور اداؤں سے خاص نسوانی جذبات و احساسات

کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ متعلقہ عہد کے آدابِ معاشرت کی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔

جب معشوقہ رخصت ہوگئی تو عاشق کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ ابھی عاشق کے دل کو قرار بھی نصیب نہیں ہوا کہ ایک غل اٹھتا ہے اور ہر طرف سوگواری کا ماحول فضا پر طاری ہو جاتا ہے۔ آہ وبکا اور نالہ وشیون کا دل دوز سلسلہ شروع ہوتے ہی عاشق کا دل گھبرانے لگتا ہے اور اسے معشوقہ کی وصیتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اس کے دل میں وہم پیدا ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس نے آخری ملاقات کے دوران جو باتیں کہی ہیں، وہ کر گزرے۔ اس خیال سے عاشق کا دل بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ جب عاشق کو کسی طرح سے چین نہیں آتا ہے تو وہ اس ماتم کی تفصیل جاننے کے لیے ایک دوست کو اس سمت بھیجتا ہے جدھر سے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ اس کا دوست واپس آکر بتاتا ہے کہ باغ کے پاس کسی سوداگر کا گھر تھا۔ یہ آہ وبکا کی آوازیں اسی گھر سے آرہی ہیں۔ اس کی وجہ تو معلوم نہیں ہوسکی لیکن آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی عزیز فوت ہوگیا ہے۔ گھر کے سارے اراکین پر غم واندوہ کا ایسا پہاڑ ٹوٹا ہے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ وہاں جو بھی موجود ہے، اس کے چہرے سے افسوس اور ماتم ہویدا ہے۔ عاشق سمجھ جاتا ہے کہ معشوقہ نے رات میں جو بات کہی تھی، وہ کر گزری ہے یعنی اس نے زہر کھالیا ہے۔ عاشق کے ساتھیوں کو اپنے دوست کی حالت زبوں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ وہ اس کا سبب دریافت کرتے ہیں لیکن وہ انھیں کچھ نہیں بتاتا ہے بلکہ وہ منھ ڈھانپ کر اور نیند کا بہانہ بنا کر پڑا رہتا ہے۔ بعد میں گھر کے دروازے پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ کیا دیکھتا ہے کہ بھیڑ اور ہجوم کی وجہ سے پورا راستہ بند ہوگیا ہے اور سوداگر کے گھر کی طرف سے جو لوگ ادھر آتے ہیں، وہ معشوق کے والدین کا الم ناک حال بیان کرتے جاتے ہیں۔

مذکورہ اشعار میں مرزا شوقؔ نے انسانی جذبات، احساسات اور عشقیہ کیفیات کے بیان میں کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ راز ونیاز کی باتیں ہوں یا عہد وپیمان کا ذکر یا پھر وصیت کا بیان، ہر جگہ انھوں نے موقع ومحل کے اعتبار سے مناسب پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اور اس بیان میں انھوں نے اودھ کی بیگمات کے محاورے اور روزمرہ کا استعمال بہت خوبی سے کیا ہے۔ قصے کے پلاٹ میں کوئی پے چیدگی نہیں ہے۔ کہانی خطِ مستقیم پر آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس پر مستزاد مرزا شوقؔ کا بیانیہ بھی صاف وشفاف ہے۔ یوں تو پوری مثنوی سادہ وپُرکار بیانیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن معشوق کی رخصتی والا حصہ اس سادہ وپُرکار بیانیہ کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ حصہ جذبات نگاری کی بھی عمدہ مثال ہے۔ عاشق کا حال زبوں ہو یا معشوق کا حالِ زار، انھوں نے انسانی جذبات وکیفیات کے بیان میں ایسی تازگی وتوانائی بھر دی ہے کہ پڑھنے والا لطف وانبساط سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ماہرینِ ادب نے 'زہرِ عشق' کو طرزِ ادا، جذبات نگاری اور سلیس زبان کی وجہ سے اُردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کیا ہے۔

18.3.5 ماحصل

نواب مرزا شوق لکھنوی کا اصل نام تصدق حسین خان اور تخلص شوق لکھنوی تھا۔ وہ حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی پیدائش ۶ رجنوری ۱۷۷۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل ہوئی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور اساتذہ کے فیضِ صحبت سے انھوں نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ مرزا شوق لکھنوی کا خاندانی پیشہ حکمت وطبابت تھا۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد وہ اپنے اسی خاندانی پیشے سے وابستہ ہو گئے اور شاہی طبیب کے اہم عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ مرزا شوق کو شعر گوئی کی تحریک لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے ملی۔ شاعری میں انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں۔ بعد میں وہ طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے پھر مثنوی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مرزا شوق واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دربار سے بہ طور وظیفہ پانچ سو روپے ملتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں ۱۸۷۱ء میں وہ سپردِ خاک ہوئے۔ ان سے تین مثنویاں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' یادگار ہیں۔ مثنوی کے علاوہ انھوں نے غزلوں اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن انھیں شہرت ومقبولیت اپنی مثنویوں کی وجہ سے حاصل ہوئی جنھیں انھوں نے اپنی فنی ہنرمندی سے پایۂ کمال کو پہنچایا۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں بول چال کے عام وخاص لہجے اور روزمرہ کے بعض متروک الفاظ اور محاورے استعمال کر کے شعر وادب کے رُخ کو بدل دیا اور اُردو شاعری کو ایک نئی سمت دی۔ ان کی مثنوی 'زہرِ عشق' اُردو کی ایک نمائندہ مثنوی ہے جس میں ایک مخصوص عہد کی لکھنوی معاشرت، وہاں کے رہن سہن اور وہاں کی طرزِ زندگی کی کمال ہنرمندی سے تصویرکشی کی گئی ہے۔ اس میں جذبات نگاری، سراپا نگاری اور جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ ان کی مثنویوں میں کچھ نقائص بھی ہیں لیکن ان سے قطع نظر، ان کی مثنویوں میں جو دوسری فنی خوبیاں ہیں، ان کی بنا پر ان کی مثنویاں بہ طور خاص 'زہرِ عشق' اُردو ادب میں زندہ رہے گی۔

18.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مرزا شوق لکھنوی کے سوانحی احوال وکوائف اور ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔
- مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری سے بحث کی۔
- مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

مرزا تصدق حسین شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہر عشق: معشوق کی رخصتی)

18.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مرزا شوق لکھنوی کے سوانحی احوال و کوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں کے نام بتائیے۔

۳۔ مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں کے ماخذ سے بحث کیجیے۔

۴۔ مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کی منفرد خصوصیات و امتیازات کو بیان کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

ہو رہے ہو ملول کس غم سے	حال دل کا کہو تو کچھ ہم سے
طعنہ آمیز دوستوں کے بیاں	ہوئے معلوم نشترِ رگِ جاں
نہ دیا ان کو مارے غم کے جواب	ڈھانپ کر منھ کیا بہانہ خواب
اٹھ گئے دوست آشنا جس دم	کھول کر منہ اٹھے وہاں سے ہم
حالِ دل سینہ میں ہوا جو تباہ	بیٹھا کمرے میں آن کر سرِ راہ
دیکھا برپا ہے ایک حشر کا غُل	بھیڑ سے راہ بند ہے بالکل
اُس طرف سے جو لوگ آتے ہیں	یہی آپس میں کہتے جاتے ہیں

18.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ نواب مرزا شوق لکھنوی کا اصل نام تصدق حسین خان اور تخلص شوق لکھنوی تھا۔ وہ حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی پیدائش ۶ رجنوری ۱۷۷۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل ہوئی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور اساتذہ کے فیضِ صحبت سے انھوں نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ مرزا شوق لکھنوی کا خاندانی پیشہ حکمت و طبابت تھا۔ ان کے والد آغا علی خان لکھنؤ کے مشہور حکیم تھے۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد وہ اپنے اسی خاندانی پیشے سے وابستہ ہو گئے اور شاہی طبیب کے اہم عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ مرزا شوق کو شعر گوئی کی تحریک لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے ملی۔ شاعری میں انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں۔ بعد میں وہ طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے پھر مثنوی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مرزا شوق واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دربار سے بہ طور وظیفہ پانچ سو روپے ملتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں ۱۸۷۱ء میں وہ

سپردِ خاک ہوئے۔

۲۔ مرزا شوق لکھنوی سے تین مثنویاں یادگار ہیں۔ 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق'۔

۳۔ مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں کے ماخذ کے سلسلے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ بعض ناقدینِ ادب نے مومن کی مثنویات اور میر اثر کی 'خواب وخیال' کو ان کی مثنویوں کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق 'خواب و خیال' میں آپ بیتی کا جو پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے، مثنویاتِ شوق میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ 'خواب وخیال' کو 'زہرِ عشق' کا ماخذ قرار دینے کے پس پردہ ان میں داخلی مماثلت کا پیدا ہونا ایک اہم وجہ ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شوق کی مثنویوں پر واجد علی شاہ کی 'بحرِ الفت' اور میر کی مثنوی 'دریائے عشق' کے اثرات ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مرزا شوق لکھنوی نے ان مثنویوں سے استفادہ کیا ہو لیکن تسلیم کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے تخیل پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔

۴۔ لکھنؤ کے روزمرہ اور محاوراتی زبان کا کام یاب استعمال، انسانی جذبات و کیفیات کا فن کارانہ اظہار، سلاست و سادگی، روانی، فنی ہنرمندی کے ساتھ کردار نگاری، سراپا نگاری، جزئیات نگاری اور ایک مخصوص عہد کی لکھنوی معاشرت، وہاں کے رہن سہن اور وہاں کی طرزِ زندگی کی دل کش مرقع کشی مرزا شوق کی مثنوی نگاری کی منفرد خصوصیات و امتیازات ہیں۔

۵۔ مذکورہ اشعار میں عاشق کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے۔ عاشق کے ساتھیوں کو اپنے دوست کی حالت زبوں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ وہ اس کا سبب دریافت کرتے ہیں لیکن وہ انھیں کچھ نہیں بتاتا ہے بلکہ وہ منھ ڈھانپ کر اور نیند کا بہانہ بنا کر پڑا رہتا ہے۔ بعد میں گھر کے دروازے پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ کیا دیکھتا ہے کہ بھیڑ اور ہجوم کی وجہ سے پورا راستہ بند ہو گیا ہے اور سوداگر کے گھر کی طرف سے جو لوگ ادھر آتے ہیں، وہ معشوق کے والدین کا الم ناک حال بیان کرتے جاتے ہیں۔

18.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
حُزنیہ	:	غم انگیز واقعہ، وہ نظم یا نثر جس میں غم انگیز واقعہ کا بیان دردناک انداز میں ہوتا ہے
طبابت	:	طب کا پیشہ، کام یا فن، ڈاکٹری، علاج کا علم
زانوئے تلمذ تہہ کرنا	:	شاگردی اختیار کرنا
اسرار	:	سر کی جمع، راز، بھید
رموز	:	رمز کی جمع، راز، اشارہ، نشانات، علامات

معیت	:	ہم راہی میں ہونا، ساتھ ہونا، ساتھ
وظیفہ	:	وہ مخصوص رقم جو کسی بادشاہ یا حکومت کی طرف سے کسی خدمت کے اعتراف کے لیے ماہ بہ ماہ مقرر کر دی جائے، پنشن
کسبی کلچر	:	جس معاشرے میں کسبی یعنی طوائف کو زیادہ اہمیت حاصل ہو
ملتفت	:	متوجہ، توجہ دینے والا، التفات کرنے والا
ناگفتنی	:	ایسی بات جو کہنے کے لائق نہ ہو، نا قابل بیان
حتمی	:	مستقل، مضبوط، یقینی
خامہ	:	قلم
کلیدی	:	مرکزی، اہم، بنیادی حیثیت کا
دہن	:	منہ
صنّاع	:	بہت بڑا کاری گر، ہنر مند
نقائص	:	نقص کی جمع، خرابی، کمی
چہرہ فق ہونا	:	چہرے کا رنگ اُڑ جانا، اوسان خطا ہونا
بسمل	:	زخمی، گھائل، مجازاً عاشق
من وعن پیش کرنا	:	جوں کا توں بیان کرنا
یدطولیٰ	:	لمبا ہاتھ، مراد کمال، مہارت، دسترس
تامل	:	جھجک، تردد، غور و فکر، اندیشہ

18.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ مثنویاتِ شوق (مرتب) : رشید حسن خاں

۲۔ تذکرۂ شوق : عطاء اللہ پالوی

۳۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد سوم) : ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۔ مقدمۂ شعر و شاعری : خواجہ الطاف حسین حالؔی

۵۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ : ڈاکٹر انور سدید

۶۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

SOCIAL MEDIA

IGNOU DIGI NEWS

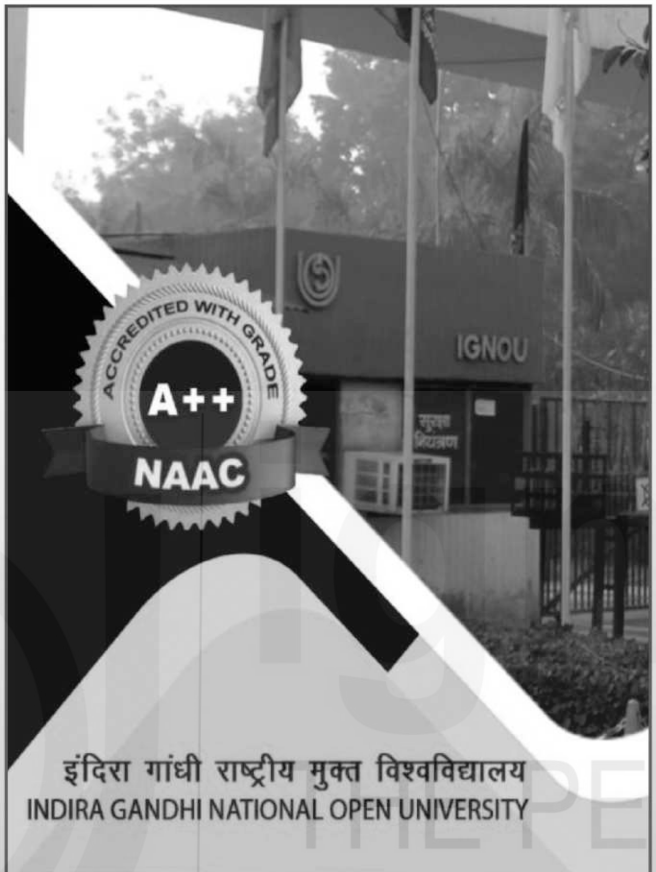

LIVE GYAN DARSHAN

gyandhara

GYAN VANI

YouTube LIVE

LIVE

SWAYAM PRABHA

Free DTH Channel for Education

online_admission

eGyankosh

eContent App

Www.ignou.ac.in

Facebook

Twitter

Instagram

QR Code generated for quick access by Students

IGNOU website
eGyankosh
e-Content APP
Facebook (@officialPageIGNOU)
Twitter (@OfficialIGNOU)
Instagram (officialpageignou)
On line admission

Like us, follow-us on the University Facebook Page, Twitter Handle and Instagram

To get regular updates on Placement Drives, Admissions, Examinations etc.

www.ignou.ac.in

MPDD/IGNOU/P.O. 2.3K/ June, 2023

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ISBN : 978-93-5568-857-6